ماہنامہ
اظہار
کراچی
APRIL 2023

رمضان المبارک کا انعام ہلال عید

مصورانہ خطاطی کے تخلیق کار عظیم آرٹسٹ ’صادقین‘

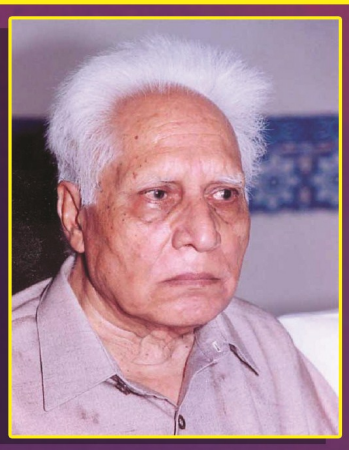

ڈاکٹر الیاس عشقی کا
وادئ مہران سے عشق

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کا بین الاقوامی محتسب انسٹی ٹیوٹ/محتسب مغربی آسٹریلیا مسٹر کرس فیلڈ،
وفاقی محتسب/صدر ایشین اومبڈسمین ایسوسی ایشن جناب اعجاز قریشی، صوبائی محتسب اعجاز علی خان، پارلیمانی سیکرٹری برائے
صحت قاسم سومرو، چیف منسٹر سندھ سید مراد علی شاہ کا گروپ فوٹو سیکرٹری سہیل راجپوت، چیئرمین پی اینڈ ڈی حسن نقوی اور دیگر۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کی کے ایم سی میگا اسپورٹس ایونٹ کے اختتام کے موقع پر فوارہ چوک میں میڈیا سے گفتگو کرتے ہوئے۔

ماہنامہ
اظہار
کراچی

جلد 27 شمارہ 04، اپریل 2023ء

نگران اعلیٰ
شرجیل انعام میمن
وزیر اطلاعات، حکومت سندھ
نگران
ندیم الرحمٰن میمن
سیکریٹری اطلاعات، حکومت سندھ
.....
مدیر اعلیٰ
منصور احمد راجپوت
ڈائریکٹر انفارمیشن پبلیکیشن
مدیرہ
ارم ملک
ڈپٹی ڈائریکٹر
.....
معاونین
رقیہ خانم، عثمان غنی
کمپوزنگ / لے آؤٹ
سید آفاق شاہ

رابطے کے لئے
ڈائریکٹر مطبوعات
محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ
بلاک 95، سندھ سیکریٹریٹ، B-4 کراچی، فون۔ 021-99202610
www.information.sindh.gov.pk/publications
publication.sid@gmail.com
@Publication_sid
@publication.sid

فہرست

•	اداریہ	ادارہ	
•	رمضان المبارک کا انعام ہلالِ عید	نسرین اختر	03
•	غزوہ بدر	محمد شعیب	07
•	حضرت عمر بن عبدالعزیز	شاہ زیب ریان	10
•	بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح	یسریٰ سلیم	14
•	علامہ اقبال کی مجلس شوریٰ	قرۃ العین ذیشان	16
•	علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی	شہناز اختر	21
•	اقبال کا فلسفہ خودی	سمیع اللہ	24
•	سیمون کا سخی قلندر	محمد سلمان	28
•	عالمگیریت تاریخی عمل کا تسلسل	سید عامر حسین	37
•	ڈاکٹر الیاس عشقی کا وادیٔ مہران سے عشق	افسانہ بدر	41
•	مصورانہ خطاطی کے تخلیق کار عظیم آرٹسٹ ''صادقین'' مرحوم	پروفیسر لطافت علی جوہر	45
•	فیض احمد فیض: رومانی اور انقلابی شاعر بیک وقت	محمد سمیع	49
•	نظریہ رواقیت ہر برائی اچھائی کا نیا ذریعہ بن سکتی ہے	اطہر بیگ	52
•	بلوچ قوم کا تاریخی پس منظر	شبیر احمد ارمان	54
•	Honor and Dignity in Islam	*Yusra Salim*	I

ناشر: محکمہ اطلاعات، حکومت سندھ
پرنٹر: پیکاک پرنٹرس اینڈ پبلشرس، کراچی۔ فون: 0300-2152634

اداریہ

علامہ اقبال

شخصیات، ادوار کی پہچان ہوتی ہیں کسی ایک زمانے میں بسنے والے لوگ اس دور کا حوالہ بن جاتے ہیں کیونکہ لوگوں کا اسلوبِ فکر اور طرزِ عمل ایسے معاشرے کو تشکیل دیتا ہے جو اس دور کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اگرچہ عوام و خواص ہر معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں مگر فطرت کا ایک قانون تسلسل سے چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی شخصیات ضرور موجود ہوتی ہیں جو انسانیت کا ناز اور قوموں کا فخر بن کر وقت کے ماتھے پر اپنا نام یوں ثبت کر دیتی ہیں کہ تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر پاتی۔

قرآن اور صاحبِ قرآن سے عقیدت اور انسیت کا جو تعلق علامہ اقبال کے ہاں دکھائی دیتا ہے وہ کسی پیمانے میں سما نہیں سکتا۔ قرآن سے آپ کا تعلق کبھی بھی محض قاری اور کتاب کا نہیں تھا بلکہ آپ کے اندر قرآن سے شغف، اور فکر و شعور کے ساتھ مطالعہ قرآن کا ایک والہانہ پن موجود تھا۔ یہ علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی تھی کہ آزادی سے کم و بیش 17 سال قبل علی الاعلان اور بالعموم لندن سے 1908ء میں واپسی کے بعد سے ہی آپ نے مسلمانوں کے ہندوستان میں مستقبل کو دیکھ لیا تھا اور نہ صرف اس حقیقت کو سمجھا بلکہ اس حقیقت کے لیے مسلمانوں کو اپنے کلام سے آگاہ بھی کیا۔ عملی سیاست کے ذریعے بھرپور انداز میں اس بیانیے کے لئے جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ 1930ء تک جو لوگ علامہ اقبال اور محمد علی جناح سمیت باقی علیحدہ پسند رہنماؤں کے مخالف تھے۔ 1937ء کے عام انتخابات کے بعد اس نظریے کے قائل ہونا شروع ہو گئے جس سے تحریک آزادی نے زور پکڑا اور 1947ء میں اقبال کا خواب پاکستان شرمندہ تعبیر ہوا۔ شاید یہی وہ خدمت تھی جس کا علامہ اقبال کے والد نے ان سے عہد لیا تھا۔ اور یہی وہ مقصد تھا جس نے علامہ اقبال کو ہندوستان کی زمین پر پیدا کیا تھا مگر امت مسلمہ کے لیے آپ کا خواب اور پیغام ابھی تک شرمندہ تعبیر ہونے کا منتظر ہے۔

ادارہ

رمضان المبارک کا انعام ہلالِ عید

نسرین اختر

اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ اس نے ہمیں رمضان اور قرآن جیسی روشن نعمتیں عطا کی ہیں، رمضان المبارک کا مہینہ رحمتوں، برکتوں، سعادتوں اور نعمتوں کا مہینہ ہے، اس کی آمد پر ہر صاحبِ ایمان فرحت و مسرت محسوس کرتا ہے اور روحانی خوشی کے ساتھ اس کا استقبال کرتا ہے اور رمضان کو خوش آمدید کہتا ہے، رمضان سے برکتیں حاصل کرتا ہے اور دینی فوائد بھی۔ قرآن حکیم میں ارشاد ربانی ہے۔

''اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں، اسی طرح جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے تھے تاکہ تم تقویٰ اختیار کرو۔'' (القرآن۔البقرہ183)

روزے کا مقصد نیکی و پرہیزگاری بیان فرمایا گیا ہے اور اسی ماہ میں قرآن پاک کا نزول ہوا تاکہ نیکی اور پرہیزگاری، پاکیزگی اور نیک کاموں کے لیے پوری پوری رہنمائی میسر آئے، قرآن مکمل ضابطہ اخلاق ہے اور دستورِ حیات بھی۔ رمضان المبارک کا سب سے بڑا عطیہ یہ ہے کہ اس ماہ مبارک میں شارعِ اسلام خاتم النبیین ﷺ پر کتاب روشن و ہدایت اتاری گئی جس کی روشنی قیامت تک نوعِ انسانی کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ قرآن مجید ارشاد فرماتا ہے۔

''رمضان کے مہینے میں قرآن اتارا گیا، اس میں لوگوں کے لئے

ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی۔ پس تم میں سے جو کوئی پائے اس مہینے کو تو روزے ضرور رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیئے دوسرے دنوں میں اللہ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا اور یہ کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ تم کو ہدایت عطا کی کہ تم احسان مانو۔'' (سورۃ البقرہ 185)

روزہ اور تزکیہ نفس:

روزے تربیت نفس کا بہترین ذریعہ ہیں۔ پاکیزہ زندگی گزارنے کیلئے نفس کی تربیت لازمی ہے، رمضان المبارک کا مہینہ عملی تربیت کا بہترین موقع فراہم کرتا ہے۔ اس مہینے میں انسان خود اپنا تجزیہ کر سکتا ہے، اپنا تزکیہ کر سکتا ہے اور خود اپنی اخلاقی تربیت کر سکتا ہے۔ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لئے روزہ تزکیہ نفس کی تربیت کا موقع فراہم کرتا ہے، روزے کا اہم ترین مقصد تقویٰ یعنی پرہیز گاری ہے۔

سحری یعنی طلوع آفتاب سے پہلے سے لے کر غروبِ آفتاب تک کچھ نہ کھانا پینا اور اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے روکے رکھنے کا نام روزہ ہے۔ روزہ صرف بھوک اور پیاس میں دن گزارنے کا نام نہیں بلکہ عربی زبان میں روزہ کو ''صوم'' کہتے ہیں اور صوم کے معنی ہیں، ''رُکنا'' یعنی شریعت کے اعتبار سے مسلمانوں کو نہ صرف بھوک پیاس کو روک لینا ہے بلکہ تمام تر نفسانی خواہشات اور برائیوں سے اپنے آپ کو ہر ممکن طریقے سے روکے رکھنا اور بچنے کا نام ''صوم'' یعنی روزہ ہے۔ دراصل اسلام کی عبادت حقیقت میں انسان کی تربیت کے لئے مقرر کی گئی ہے اور یہ تربیت انسان کو اللہ تعالیٰ کے قرب تک لے جاتی ہے۔ روزہ تزکیہ نفس کا بہترین ذریعہ ہے جو ہمیں ہر سال رمضان المبارک کے مہینے میں حاصل ہوتا ہے اور قیامت تک ہوتا رہے گا۔

ماہرینِ نفسیات کے مطابق تین خواہشات انسان میں سب سے شدید ہوتی ہیں۔ بھوک، پیاس اور جنسی خواہش، اگر انسان ان پر قابو پانا سیکھ لے تو دیگر خواہشات پر آسانی سے قابو پا سکتا ہے، روزے کی حالت میں یعنی روزے کے دوران انہی تینوں خواہشات پر قابو پانے کی تربیت دی جاتی ہے۔ ماہرینِ نفسیات کا کہنا یہ بھی ہے کہ اگر کوئی عمل صرف تین ہفتوں تک مسلسل کیا جائے تو اس کی عادت پڑ جاتی ہے۔ رمضان کے چار ہفتوں کے مسلسل روزے انسان کو مجاہدہ نفس اور تزکیہ نفس کی مکمل تربیت دیتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ گیارہ مہینے خواہشات کے مطابق زندگی گزارنے والے مسلمان رمضان المبارک کے مہینے کی تربیت کی وجہ سے اپنے اندر جذبہ اور قوت ارادی پیدا

''رمضان کے مہینے میں قرآن اتارا گیا، اس میں لوگوں کے لئے ہدایت ہے اور روشن دلیلیں ہیں راہ پانے کی اور حق کو باطل سے جدا کرنے کی. پس تم میں سے جو کوئی پائے اس مہینے کو تو روزے ضرور رکھے اور جو کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو اس کو گنتی پوری کرنی چاہیئے دوسرے دنوں میں اللہ تمہارے لئے سہولت چاہتا ہے، دشواری نہیں چاہتا اور یہ کہ تم گنتی پوری کرو اور اللہ کی بڑائی کرو اس بات پر کہ تم کو ہدایت عطا کی کہ تم احسان مانو.'' (سورۃ البقرہ 185)

کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں جس کے اثرات رمضان کے بعد بھی انسانی کردار وافعال میں نظر آتے ہیں۔

روزہ رکھنے سے انسانی جسم پر مثبت اثرات مرتب ہوتے ہیں، اور روزے کے فوائد دنیا و آخرت میں حاصل ہوتے ہیں۔ روزے کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے جسم کا نظام دفاع مضبوط ہوتا ہے۔ کم خوراک کھانے کی صورت میں جسم میں زہریلے مادے کم پیدا ہوتے ہیں اور یوں جسم کا نظام دفاع مضبوط ہو جاتا ہے۔ حدیث میں آتا ہے، روزہ ڈھال ہے'' یعنی روزہ انسان کو نفسانی خواہشات سے بچاتا ہے۔ لیکن روزے کے روحانی فوائد تب ہی حاصل ہوتے ہیں جب تمام صغیرہ اور کبیرہ گناہوں سے بچا جائے۔ ایک حدیث مبارک میں حضور اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا۔ ''ہر چیز کی زکواۃ ہے اور جسم کی زکواۃ روزہ ہے۔'' (سنن ابن ماجہ) زکواۃ مال میں سے گندگی نکال کر اسے پاک وصاف کر دیتا ہے اسی طرح روزہ جسم سے زہریلے مادے اور برائیوں کو نکال کر اس کو صاف شفاف کر دیتا ہے۔

روزے کے معاشرے پر اثرات:

روزہ صحت کیلئے مفید ہے اور خاص طبّی نقطہ نظر سے بھی ہر شخص کے لیئے مناسب اور بہتر ہے کہ وہ رمضان کے روزے رکھے۔ روزے محض صحت کو بہتر رکھنے کیلئے ہی نہیں بلکہ اس کے اثرات پورے معاشرے پر مثبت پڑتے ہیں۔ کیونکہ روزہ نہ صرف انسان کو عمل خیر کی طرف مائل کر دیتا ہے بلکہ اس کے اندر ہمدردی اور غم خواری کا جذبہ بھی کارفرما ہو جاتا ہے اور اسی جذبے کے تحت وہ غریبوں اور مسکینوں سے اظہار ہمدردی کرنے لگتے ہیں، بھوکے پیاسے رہنے کی وجہ سے غریبوں کی بھوک پیاس کا احساس اجاگر ہوتا ہے، یوں وہ زیادہ سے زیادہ صدقہ خیرات کی طرف مائل ہو جاتے ہیں، لہذا انسان اللہ کی دی ہوئی نعمتوں

میں سے زیادہ سے زیادہ تقسیم کرکے اپنے نفس کو تسکین پہچاتا ہے۔

رمضان المبارک کے مہینے میں نہ صرف روزے بلکہ ہر عمل کا ثواب کئی گنا زیادہ کردیا جاتا ہے۔ اور مومن کے رزق میں اضافہ کردیا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو نہ صرف زکواۃ اور صدقہ خیرات زیادہ سے زیادہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے بلکہ روزہ دار کو روزہ افطار کروانے کا حکم بھی دیا گیا ہے اور اس عمل کا اجر بھی بہت زیادہ ہے۔ روایت ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا، ''جو شخص کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروائے یا کسی غازی کیلئے سامانِ جہاد فراہم کرکے دے تو اس کو ویسا ہی اجر ملے گا جیسا کہ اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا اور غازی کو جہاد کرنے کا اجر ملے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد فرمایا کہ ''جو شخص کسی روزہ دار کا روزہ افطار کروائے تو وہ اس کے گناہوں کی مغفرت کا اور اس کی گردن کو دوزخ کی سزا سے بچانے کا ذریعہ ہے، اس کو اتنا ہی اجر ملے گا جتنا کہ اس روزہ دار کو روزہ رکھنے کا ملے گا۔ بغیر اس کے کہ اس روزہ دار کے اجر میں کوئی کمی ہو۔'' ایک اور جگہ ارشاد فرمایا۔

''اور شخص کسی روزہ دار کو پیٹ بھر کر کھانا کھلادے، اللہ تعالیٰ اسے میرے حوض سے پانی پلائے گا۔ پھر اسے اس وقت تک پیاس محسوس نہ ہوگی، جب تک کہ وہ جنت میں داخل نہ ہو جائے۔''

بلاشبہ رمضان المبارک ایسا مبارک مہینہ ہے جس میں روزے کی برکت سے انسان برائیوں سے دور ہو کر نیکیوں کا خوگر بن جاتا ہے، اس کے اندر دوسرے کی مدد کرنے، گناہوں سے بچنے، بھوکوں کو کھانا کھلانے، مساکین کو لباس پہنانے کی ترغیب ہو جاتی ہے۔ اور یہی ترغیت معاشرے میں ہمدردی اور امداد باہمی کا باعث بنتی ہے، لوگوں کے اندر مساوات اور یکجہتی فروغ پاتی ہے۔ کیونکہ اسلامی عبادات دراصل اسلامی وحدت اور یکجہتی کا مظہر ہیں۔ اس ماہ میں مسلمان تمام عباداتی عمل ایک مقررہ وقت میں سرانجام دیتے ہیں، جس کے تحت وہ نظم و ضبط کے ان تمام اصولوں کے پابند ہو جاتے ہیں جو رمضان میں بنادیئے جاتے ہیں، تمام ملت اسلامیہ ایک ہی وقت میں روزہ رکھنے اور ایک ہی وقت میں روزہ افطار کرکے اجتماعی عمل کا مظاہر کرتے ہیں۔

ہلالِ عید اجتماعی خوشی کا مظہر:

رمضان المبارک میں روزے رکھنے والوں کا اجر عیدالفطر کی صورت میں عطا کیا گیا۔ روزے کے اختتام پر ہلالِ عید کا نور اجتماعی خوشی کی نوید لاتا ہے، بالخصوص ان لوگوں کیلئے جنہوں نے پورے اخلاص کے ساتھ روزے رکھے، اور اپنا دامن رمضان کی تمام تر برکات، فیوضی سے بھر لیا پھر اپنے رب کا شکر ادا کیا۔ جس نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا کہ ''روزہ میرے لیے ہے اور میں ہی اس کی جزا دوں گا۔''

رب العزت نے اس مہینے کو ہمارے لیے رحمت، مغفرت اور جہنم سے نجات بنایا، جنت کا راستہ مزید واضح کیا، اس مقدس مہینے کے اختتام پر ہم اپنے رب سے طلب گار ہیں کہ یہی رحمت، برکت اور مغفرت آئندہ رمضان تک ہمارے سر پر سایہء فگن رکھنا، ہمارے رزق میں برکت رکھنا۔ سنت پر عمل کی قوت دینا اور ہمیں توفیق دینا کہ ہم زکواۃ و صدقات سے مال کو پاکیزہ بنائیں۔ تیری رحمت، عافیت ہمیں اور ہمارے پیاروں کو اور ہماری امت مسلمہ کو یونہی اپنے دامن میں سمیٹتے رہے۔'' ہلالِ عید دیکھ کر شکرانہء نعمت ادا کرنا ہر گز نہ بھولیں صدقہ فطر ضرور ادا کریں۔ یوں تو ہر اسلامی مہینے کی چاند رات ہوتی ہے مگر ہلالِ عید دنیا بھر کے مسلمانوں کیلئے جو خوشی لے کر آتا ہے اس کی مثال نہیں ملتی۔ ہلال عید سے مسلمانوں میں خوشی و مسرت کی جو لہر دوڑ جاتی ہے وہ روح تک کو سرشاری عطا کرتی ہے، قارئین کرام کو ہلال عید مبارک ہو۔

غزوہ بدر

محمد شعیب

2 ہجری ماہِ رمضان المبارک کی 17 تاریخ بمطابق 13 مارچ 624ء جمعۃ المبارک کے دن حق و باطل اور کفر و اسلام کا وہ پہلا عظیم الشان معرکہ پیش آیا جسے اسلامی تاریخ میں ''غزوہ بدر'' اور قرآن کی اصطلاح میں ''یوم الفرقان'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

غزوہ بدر نے کفر و اسلام، ہدایت و گمراہی کے فرق کو واضح کر دیا حق و باطل کے درمیان حدِ فاصل قائم کر دی اور اب حق و باطل اور کفر و اسلام میں سے کسی بھی راہ کو اختیار کرنے والے کے لیئے راستے کا تعین آسان ہو گیا۔ حقیقت یہ ہے کہ بدر کا یہ معرکہ اتنا عظیم الشان ہے کہ تاریخ اسلام کے عظیم ترین غزوات کے لیئے یہ اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ غزو بدر کے اسباب اور اس غزوہ میں ابتداء سے انتہا تک پیش آنے والے واقعات کا تفصیلی جائزہ پیش کیا جائے تو یہ بہت طویل قصہ ہو جائے گا مختصراً 17 رمضان المبارک کی صبح نبی کریم ﷺ نے جنگ کی تیاری فرمائی۔ حضرت سعد بن معاذؓ کی رائے سے نبی کریم ﷺ کے قیام کے لیئے ایک اونچے ٹیلے پر گھانس پھونس اور کھجور کے پتوں سے ایک چھپر تیار کیا گیا یہ چھپر ایک ایسے بلند ٹیلے پر بنایا گیا جہاں سے پورا میدان کارزار نظر آتا تھا۔ یہ دنیا کے سب سے جلیل القدر سپہ سالار ﷺ کا کنٹرول روم تھا۔

سورج کے طلوع ہونے کے ساتھ کفر و اسلام کے لشکر بھی طلوع

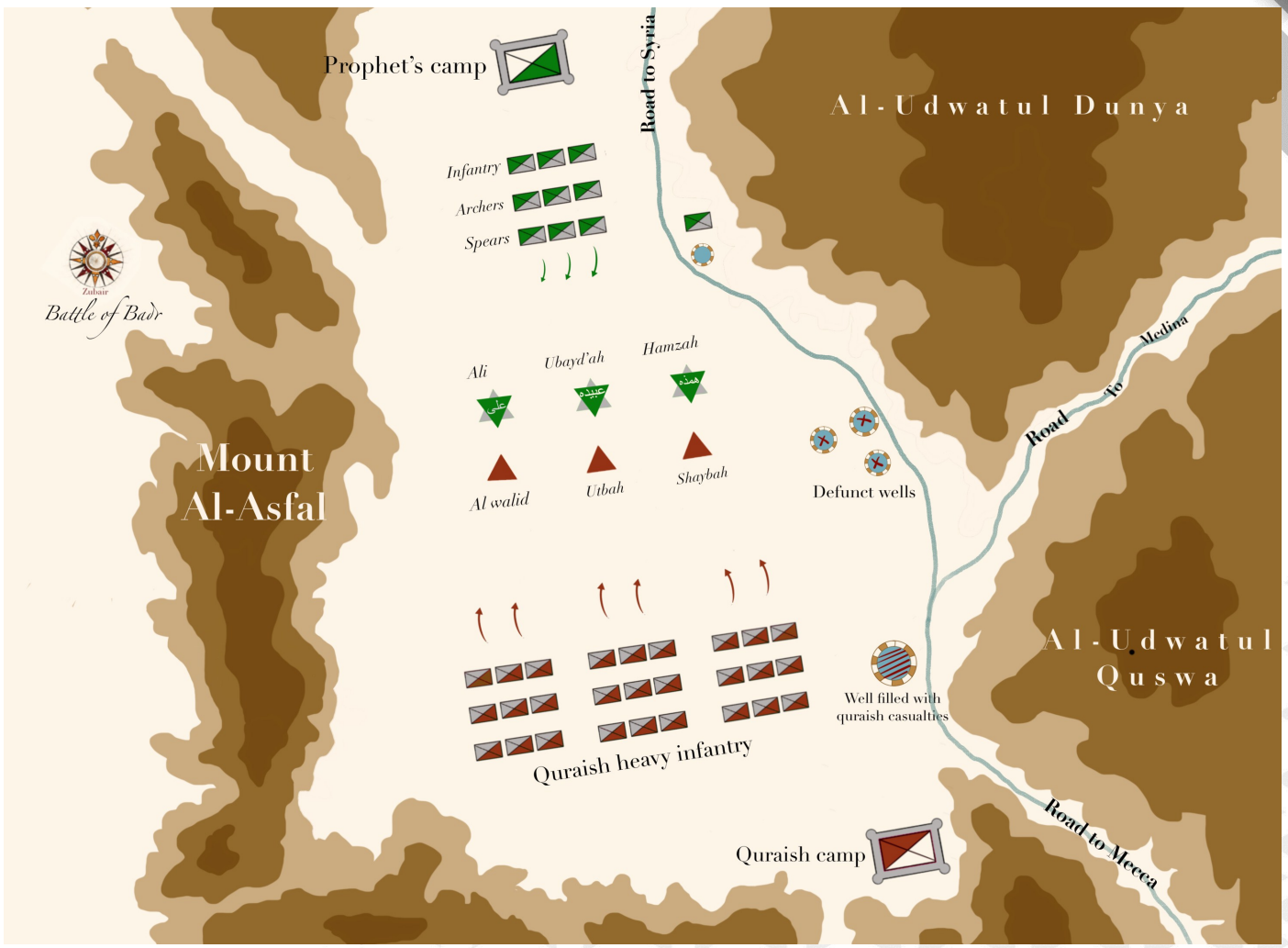

ہوئے۔ مسلمانوں کی صف بندی کے بعد نبی کریم ﷺ چھپر میں تشریف لے آئے اگلی صف سے سردارِ لشکر رئیس مکہ عتبہ بن ربیع نکلا اسلامی لشکر کے آگے کھڑے ہو کر اس نے للکارا جسے موت کی آرزو ہو آگے بڑھے۔ تین انصاری صحابہؓ مقابلے کے لیئے نکلے، عتبہ نے کہا ''تم ہم سے لڑو گے'' جاؤ محمد ﷺ کے گھر والوں کو بھیجو۔ مسلمانوں کے لشکر سے مہاجرین نکلے۔ اور لشکر اسلام سے یاحی یاقیوم کا نعرہ بلند ہوا۔ حضرت حمزہؓ کے مقابلے میں عتبہ بن ربیع مارا گیا، حضرت علیؓ کے آگے ولید جیسا بہادر پڑا دم توڑ رہا تھا۔ حضرت علیؓ اور حضرت حمزہؓ نے حضرت عبیدہؓ کو سہارا دیا۔ اور شیبہ کو قتل کر دیا۔ اپنے تین بڑے بہادروں کو اس طرح ختم ہوتا دیکھ کر مشرکین مکہ نے مسلمانوں پر ہلہ بول دیا اور حق و باطل ایک دوسرے پر جھپٹ پڑے۔ اب عام جنگ شروع ہو گئی۔ حضرت حمزہؓ، حضرت علیؓ، حضرت زبیرؓ، حضرت ابو دجانہؓ اور حضرت سعدؓ جیسے شیر اپنے کچھار سے نکل چکے تھے، اس دوران جب کہ گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی۔ آنحضرت ﷺ، حضرت ابو بکر صدیقؓ کو ساتھ لیئے ہوئے چھپر کے دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ حضور ﷺ نے جب اپنے اصحاب اور احباب کی قلب اور بے سروسامانی کو اور دشمن

کی کثرت اور قوت کو دیکھا تو نماز کے لیئے کھڑے ہوگئے اور دیر تک ہاتھ پھیلائے یہی دعا فرماتے رہے کہ ''اے اللہ اگر یہ جماعت ہلاک ہوگئی تو پھر زمین پر تیری پرستش نہیں ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے فتح و نصرت کا جو وعدہ فرمایا تھا، اس کو پورا بھی فرمایا۔ مسلمانوں کو فتح ہوئی اور مشرکین کو شکست۔ 70 قریش جہنم واصل ہوئے۔ اور 70 گرفتار ہوئے۔ ابو جہل کا انصار کے دو نوجوان معاذؓ اور معوذؓ نے سر کاٹا۔ ابو جہل کے علاوہ قریش مکہ کے بہت سے جگر پاروں کو عبرت ناک موت کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلمانوں میں 14 صحابہؓ کو شہادت نصیب ہوئی۔

غزوہ بدر ایک انقلاب آفریں اور تاریخ ساز واقعہ ہے۔ اگر اس غزوہ میں مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو بنی نوح انسان کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ غزوہ بدر کے دو پہلو ہمارے سامنے آتے ہیں، ایک پہلو یہ کہ اس غزوہ میں مسلمانوں کی فتح سے وہ قریش مکہ کے مقابلے میں برابر کے فریق بن چکے تھے عرب کے قبائل اور خصوصاً قریش مکہ پر مسلمانوں کی عسکری اور فوجی دھاک بیٹھ گئی۔ اور تمام قبائل کو اس بات کا احساس ہوگیا کہ مسلمانوں کو ختم کرنا اور طاقت کے ذریعے ان کا استحصال کرنا ناممکن ہے۔ اس وجہ سے یہود اور مدینہ منورہ میں موجود دوسرے قبائل نے مسلمانوں کے ساتھ مصلح جدوجہد ترک کردی۔

اس فتح سے مسلمانوں کے سیاسی اور ثقافتی اثر و رسوخ میں بھی اضافہ ہوا۔ اور اس طرح اسلامی تحریک کو مدینے سے نکل کر سارے عرب میں پھیلنے کے لیئے راہیں مل گئیں۔ اور ایک اہم فائدہ اس فتح سے یہ ہوا کہ قریش کی قدیم تجارتی شاہراہ غیر محفوظ ہوگئی۔ وہ مال اسباب جو اس تجارت کے ذریعے مسلمانوں کے خلاف جنگوں اور ریشہ دوانیوں میں استعمال ہو سکتا تھا۔ اس پر ایک زبردست چوٹ پڑی اور یہ مسلمانوں کی بہت بڑی کامیابی تھی غزوہ بدر کے اگر دوسرے رُخ کو دیکھا جائے۔ یعنی یہ کہ مسلمانوں کو اس جنگ میں شکست ہوتی تو مسلمانوں اور بنی نوع انسان کے لیے کیا مضر اثرات مرتب ہوتے۔ اگر مسلمانوں کو شکست ہو جاتی تو انسانیت توحید کی روشنی، رسالت کی ضیاء پاشیوں، آخرت کے قانون جزا و سزا اور قانون عدل و انصاف آنحضرت ﷺ کی رحمۃ العالمین سے محروم ہو جاتی۔ دنیا امن و سلامتی سے محروم ہو جاتی، دنیا میں علم و حکمت کا احیا نہ ہوتا، ثقافت انسانی میں جمود اور ٹھہراؤ آجاتا۔ اخلاق حسنہ کی تکمیل نہ ہوتی اور انسانیت نہ جانے کب تک شرک و جہالت ظلم و بربریت کی تاریکیوں میں بھٹکتی رہتی۔

آنحضرت ﷺ نے میدان جنگ میں جو دعا مانگی تھی۔ ''اے اللہ، اگر یہ مٹھی بھر جماعت ہلاک ہوگئی، تو پھر قیامت تک تیری پرستش نہیں ہوگی۔'' اس میں بھی یہی حقیقت مضمر تھی۔

اس مٹھی بھر جماعت کے دم سے اسلام کی کرنیں سارے عالم میں پھیل گئیں۔ ویسے تو تمام صحابہؓ آسمان دنیا کے روشن ستارے تھے لیکن وہ اصحاب جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی۔ ان کی تو بات ہی اور تھی۔ یہی وجہ ہے کہ نہ صرف عہد نبوی ﷺ بلکہ خلافت راشدہ کے زمانے میں بھی اہل بدر کو دوسرے مسلمانوں سے افضل سمجھا جاتا تھا۔ یہ مسلمانوں کی قوت ایمانی اور حسنِ اعمال ہی کا نتیجہ تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان سے فرشتے نازل فرما کر مسلمانوں کی غیبی مدد کی۔ خدا کی طرف سے یہ وعدہ کسی وقت اور مقام کے ساتھ مشروط نہ تھا۔ بلکہ یہ وعدہ ہر مقام اور ہر وقت کے لیئے ہے۔ لیکن ضرورت صرف اس جذبہ ایمانی اور اس عشق حقیقی کی ہے۔ جو اسلام کے دورِ اول میں تھا۔ اگر مسلمانوں میں وہ جذبہ اور وہ عشق پیدا ہو جائے تو انہیں فتح و نصرت سے کوئی نہیں پیچھے کر سکتا۔ اور ساتھ ساتھ اللہ کی مدد بھی ایسی طرح شامل حال رہے گی۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز

شاہ زیب

خلافت راشدہ کے بعد آنحضور ﷺ کی پیشگوئی کے مطابق نیم تربیت یافتہ مسلمانوں میں جاہلی رجحانات عود کر آئے اور امت محمدیہ انتشار کا شکار ہونے لگی۔61ھ میں حضرت امام حسینؓ کی شہادت کا واقعہ رونما ہوا۔ حرم مقدس میں جنگ وجدل شروع ہو گیا اور حجاج کی حرم پر سنگ باری سے خانہ کعبہ کی عمارت کو بھی نقصان پہنچا۔ حکام نے اپنے مخالفین کا قتل عام شروع کر دیا۔ مروان نے ایک بدعت یہ جاری کی کہ خطبہ، عید کی نماز سے پہلے شروع کروادیا۔ خطبات میں حضرت علیؓ کے خلاف زبانِ طعن دراز کی جانے لگی۔ایسے سنگین حالات میں اللہ تعالیٰ نے تجدید دین کے لئے اپنا وعدہ پورا کیا اور 99ھ میں حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ کے وجود میں مسلمانوں کو ایک مجدد عطا کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز 61ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ بانی سلطنت بنو امیہ مروان کے پوتے تھے اور آپ کی والدہ حضرت عمر بن خطابؓ کی پوتی تھیں۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد میں سے ایک شخص پیدا ہو گا جس کے چہرے پر داغ ہو گا اور وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ یہ پیشگوئی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وجود میں لفظاً لفظاً پوری ہوئی۔ جب آپ اپنے پیشرو سلیمان کی تدفین سے فارغ ہو کر آ رہے تھے تو آپ نے شاہی سواریاں لوٹادیں اور فرمایا میرے لئے میرا خچر ہی کافی ہے۔ خلیفہ

حضرت عمر بن عبدالعزیز 61ھ میں پیدا ہوئے۔ آپ بانی سلطنت بنو امیہ مروان کے پوتے تھے اور آپ کی والدہ حضرت عمر بن خطابؓ کی پوتی تھیں۔ حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے کہ میری اولاد میں سے ایک شخص پیدا ہوگا جس کے چہرے پر داغ ہوگا اور وہ زمین کو عدل سے بھر دے گا۔ یہ پیشگوئی حضرت عمر بن عبدالعزیز کے وجود میں لفظاً لفظاً پوری ہوئی۔

بنتے ہی آپ نے پہلا اعلان یہ کیا کہ میں کوئی فیصلہ کرنے والا نہیں ہوں بلکہ صرف احکام الٰہی کو نافذ کرنے والا ہوں۔ چنانچہ واقعۃً دو سال میں آپ نے بدعات کا خاتمہ کیا، امراء و عمال کا احتساب کیا اور بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح کردی۔ آپ صرف دو سال پانچ ماہ خلیفہ رہ کر101ھ میں چالیس سال کی عمر میں وفات پاگئے۔ قرائن موجود ہیں کہ آپکے خاندان والوں نے زہر دے کر آپ کی زندگی کا خاتمہ کیا۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز کے تجدیدی کارناموں کے بارے میں ایک مضمون مکرم نصیر احمد انجم صاحب کے قلم سے روزنامہ ''الفضل'' ربوہ23و24، جولائی1998ء میں شامل اشاعت ہے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کا سب سے بڑا کارنامہ تدوین حدیث کی طرف عملی توجہ ہے۔ چنانچہ پھر علماء کی اس طرف توجہ ہوئی اور بعد ازاں احادیث کے عظیم الشان مجموعے تیار ہوئے۔

آپؒ نے دوسرا کام یہ کیا کہ سختی سے اسلامی حدود و شرائع کی پیروی کروائی اور بدعات سے پرہیز کی تلقین کی۔ آپؒ سے پہلے نماز باجماعت میں بہت بے قاعدگی آگئی تھی حتّٰی کہ حجاج نے نماز کی پابندی بالکل ترک کردی تھی۔ آپؒ نے دوبارہ نماز کو کھڑا کیا اور ایک بار فرمایا جس نے نماز ضائع کی وہ دوسرے فرائض اسلام کا سب سے زیادہ ضائع کرنے والا ہوگا۔ اسی طرح آپؒ کے دور میں زکوٰۃ کا نظام ایسا مؤثر ہوا کہ

زکوٰۃ و صدقہ قبول کرنے والا کوئی نہ ملتا تھا۔ اسی طرح حجاج نو مسلموں سے بھی جزیہ وصول کیا کرتا تھا، آپ نے اسے بند کروادیا۔ پھر مروان کا وہ حکم منسوخ کردیا کہ باغ فدک اُس کی ذاتی جاگیر میں شامل سمجھا جائے۔ آپؒ نے آنحضور ﷺ اور خلفائے راشدین کے طرز عمل کے مطابق اُس کی آمدنی بنوہاشم پر خرچ کرنا شروع کردی۔

اُس زمانہ میں شراب نوشی کا رواج عام ہو رہا تھا۔ آپؒ نے حکماً اس پر پابندی لگادی اور شراب نوشی کی دکانوں کو بند کروادیا۔ آپؒ نے شخصی خلافت کا جاری رواج ختم کردیا اور منع کردیا کہ نماز کے بعد خلفاء پر درود بھیجا جائے یا لوگ مخصوص طریق پر انہیں سلام کریں۔ خلیفہ کے ساتھ نقیب اور علمبردار کا چلنا بھی موقوف کردیا۔ حتّٰی کہ فجر اور عشاء کی نمازوں کے وقت شمع بردار کا ساتھ جانا بھی بند کروادیا۔ بلکہ ذاتی کاموں کے وقت بیت المال کا چراغ گل کروا دیتے۔ آپؒ نے شاہی خاندان کو ملنے والا وظیفہ خاصہ بھی بند کروادیا۔

آپؒ کے دور میں ایک بار پھر اسلامی خلافت جاری ہوگئی۔ آپؒ کے خطوط میں اخلاقی نصائح ہوتیں یا اسلامی قوانین اور تعزیرات کی وضاحت ہوتی۔ آپؒ نے نوحہ گری اور عورتوں کا جنازے کے ساتھ جانا بند کروادیا۔

آپؒ سے پہلے بہت سے اموال کو شاہی خاندان نے ذاتی جاگیر قرار دے دیا تھا لیکن آپؒ نے اپنی ساری موروثی جاگیر بیت المال کے سپرد کردی۔ یہ عمل سارے خاندان کی مخالفت مول لینے کے برابر تھا۔ چنانچہ جب کسی نے اولاد کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ اولاد کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ آپؒ بیت المال کی ذرا سی خیانت بھی برداشت نہ کرتے۔ چنانچہ جب ایک مرتبہ یمن کے بیت المال سے ایک اشرفی گم ہوگئی۔ آپؒ نے وہاں کے حاکم کو لکھا کہ میں تمہاری امانت پر بدگمانی نہیں کرتا لیکن تمہیں لاپرواہی کا مجرم قرار دیتا ہوں۔ تم پر فرض ہے کہ اپنی صفائی پر شرعی قسم کھاؤ۔

آپؒ سے پہلے قیدیوں سے بہت برا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ معمولی شبہ پر گرفتار کرکے قتل کردیئے جاتے تھے۔ جو قیدی جیل میں مر جائے وہ بے گور و کفن رہتے اور دوسرے قیدی تعفّن سے بچنے کے لئے خود پیسے جمع کرکے اسے دفناتے۔

آپؒ نے حکم دیا

آپؒ سے پہلے قیدیوں سے بہت برا سلوک روا رکھا جاتا تھا۔ معمولی شبہ پر گرفتار کرکے قتل کردیئے جاتے تھے۔ آپؒ کے دور میں ایک بار پھر اسلامی خلافت جاری ہوگئی۔ آپؒ کے خطوط میں اخلاقی نصائح ہوتیں یا اسلامی قوانین اور تعزیرات کی وضاحت ہوتی۔ آپؒ نے نوحہ گری اور عورتوں کا جنائز کے ساتھ جانا بند کروادیا۔

آپؒ سے پہلے بہت سے اموال کو شاہی خاندان نے ذاتی جاگیر قرار دے دیا تھا لیکن آپؒ نے اپنی ساری موروثی جاگیر بیت المال کے سپرد کردی۔ یہ عمل سارے خاندان کی مخالفت مول لینے کے برابر تھا۔ چنانچہ جب کسی نے اولاد کے متعلق سوال کیا تو فرمایا کہ اولاد کو خدا کے سپرد کرتا ہوں۔ آپؒ بیت المال کی ذرا سی خیانت بھی برداشت نہ کرتے تھے۔

کہ قیدی کو ایسی بیڑی نہ پہنائی جائے جس سے وہ کھڑا ہو کر نماز نہ پڑھ سکے نیز بجز قاتل کے ہر ایک کی بیڑی رات کو کھول دی جائے۔ قیدی کو موسم کے مطابق لباس بھی دیا جائے اور عورت کو برقعہ بھی دیا جائے۔ آپؒ نے قیدیوں کا پابند سلاسل ہو کر بھیک مانگنا موقوف کر دیا اور فرمایا کہ جو لاوارث قیدی مر جائے تو اُس کی تجہیز و تکفین بیت المال سے کی جائے۔ اسی طرح تعزیر میں حد سے بڑھنے سے منع کیا اور فرمایا کہ بجز شرعی حق کے مسلمان کی پیٹھ ننگی نہ ہو۔ نیز آپؒ نے عورتوں کے حمام جانے پر پابندی لگادی اور حماموں کی دیواروں پر بنائی جانے والی تصاویر مٹوادیں۔

آپؒ سے پہلے اموی خلفاء کے عہد میں عمال خطبے میں حضرت علیؓ پر لعن طعن کیا کرتے تھے۔ آپؒ نے اسے ختم کرکے یہ آیات پڑھنے کا حکم دیا ''ان اللہ یامر بالعدل والاحسان ... لعلّکم تذکّرون۔'' چنانچہ آج تک اسی پر عمل ہو رہا ہے۔

امیر وقت پارسیوں سے اُن کے تہوار کے روز ایک کروڑ ہدیہ وصول کرتے تھے۔ آپؒ نے اسے یکلخت موقوف کر دیا۔ بلکہ آپؒ نے علم کی ترویج کے لئے علماء اور طلباء کو وظائف جاری کئے اور علماء کو ہر طرف پھیلا دیا۔ آپؒ نے اسلامی فوج کو نصیحت کی کہ جب تک اسلام کی دعوت نہ دی جائے تب تک حملہ نہ کیا جائے۔ آپؒ نے بہت سے بادشاہوں کو تبلیغی خطوط بھی لکھے جن میں سے بعض نے اسلام بھی قبول کر لیا۔ ■

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح

یسریٰ سلیم

بانی پاکستان قائداعظم محمد علی جناح نے 8 مارچ 1944ء کو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں خطاب کرتے ہوئے کہا تھا ''پاکستان اس دن وجود میں آیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا'' یہ اس زمانے کی بات ہے جب یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہوئی تھی' مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد کلمہ توحید ہے' ہندوستان میں جب پہلا مقامی شخص مسلمان ہوا تو وہ ہندو قوم کا فرد نہیں رہا اسی فرد کے ذریعے ہندوستان میں ایک نئی قوم مسلمان وجود میں آگئی۔

1857ء کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کی انگریز حکمرانوں کے خلاف مزاحمت کی وجہ سے انگریز بھی مسلمانوں کے دشمن بن گئے تھے' انہوں نے بطور پالیسی مسلمانوں کو اقتدار میں آنے سے روکنے کیلئے ہندوؤں کی حمایت شروع کر دی اور ہندوؤں ہی کے ذریعے من حیث القوم مسلمانوں کو دبائے رکھا۔ سرسید احمد خان پہلے مسلمان رہنما تھے جنہوں نے محسوس کیا کہ ہندو اور مسلمان ہر لحاظ سے دو مختلف قومیں ہیں جو ایک ساتھ نہیں رہ سکتیں۔

اس طرح سے دو قومی نظریئے کی داغ بیل ڈالی گئی' سرسید کے نظریے کو تحریک پاکستان کے دوسرے رہنماؤں نے بھی اپنالیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین لسانی مسئلے نے تنازعہ کی

صورت اختیار کی اور تعصب کی شدت میں روز بروز اضافہ ہونے لگا۔اس کی اوّلین صورت اس وقت سامنے آئی جب ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہو گیا کہ سرکاری عدالتوں میں بھاشا اور دیوناگری رسم الخط جاری کیا جائے اور اردو زبان کو موقوف کیا جائے۔یہ پہلا موقعہ تھا جب سرسید نے بھانپ لیا کہ اب ہندوؤں اور مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ ساتھ چلنا مشکل ہو گیا ہے۔ مولانا حالی، سرسید کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''انہیں دنوں جب یہ چرچا بنارس میں پھیلا، ایک روز مسٹر شیکسپیئر سے، جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے، میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے تو انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقعہ ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔''

''میں نے کہا اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے، آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں، بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا، دیکھے گا۔ انہوں نے کہا اگر یہ پیشگوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا' مجھے بھی نہایت افسوس ہے مگر اپنی پیشگوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔''(حیات جاوید۔ ص192)

1867ء میں اردو اور ہندی کے جھگڑے نے سرسید احمد خان کو کسی قدر بددل کر دیا اور بنارس کے کمشنر شیکسپیئر سے انھوں نے اپنے جن خدشات کا اظہار کیا اس کو بنیاد بنا کر کچھ مؤرخین نے سرسید کو، دو قومی نظریہ، کا بانی اور، تحریک پاکستان، کا روح رواں قرار دیا۔

پروفیسر ایم ایس جین اپنی کتاب '' The Aligarh Movement'' میں لکھا ہے کہ غدر کے بعد ہندو اور مسلمانوں کو ایک قوم بننے کا موقع ملا تھا لیکن اس موقع کو سرسید نے استعمال نہیں کیا کیونکہ وہ صرف مسلمانوں کا سوچتے تھے۔ علی گڑھ تحریک صرف مسلمانوں کے مستقبل کے تحفظ کے لئے بپا کی گئی اور بالآخر تحریک پاکستان پر منتج ہو گئی۔

قرارداد پاکستان کی تاریخ سے عیاں ہے کہ اس کو نامور علمی و سیاسی شخصیات کے نظریات، خیالات اور تصّورات سے استفادہ کرتے ہوئے تخلیق کیا گیا... کسی ایک فرد کو اس کا خالق نہیں کہا جا سکتا! رنگا رنگ اور ہمہ نوعی نظریات کا جوہر نکال لینا آسان کام نہ تھا۔ مسلم اکثریتی صوبوں اور مسلم اقلیتی صوبوں میں آباد مسلمانوں کی اپنی اپنی مخصوص ضروریات تھیں۔ لہٰذا مسلم لیگی لیڈروں پر ایسی قرارداد وضع کرنے کی بھاری ذمے داری آن پڑی جو سبھی مسلمانوں کے مفادات کا خیال رکھ سکے۔ نہایت کٹھن کام کے سبب ہی قرارداد میں کچھ ابہام بھی رہ گئے جنہوں نے آگے چل کر مسائل کھڑے کیے۔ اور یہی وجہ ہے کہ بدلتے اور نت نئے تقاضوں کے تحت قرارداد کا متن کئی بار تبدیل بھی ہوا۔ تاہم قائدِ اعظم کی زیر قیادت مسلم لیگی رہنما مسلمانانِ ہند کا مستقبل محفوظ کرنے کیلئے قرارداد لاہور کی صورت پہلا ٹھوس قدم اٹھانے میں ضرور کامیاب رہے۔ اس قرارداد نے دنیا والوں پر آشکارا کر دیا:

1. مسلمانانِ ہند ایک قوم ہیں۔
2. ہندوستان میں مخصوص مذہبی، سیاسی و معاشرتی حالات کے باعث برطانوی جمہوری نظام کامیابی سے نہیں چل سکتا۔
3. جن ہندوستانی صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہیں، وہاں آزاد ریاستیں تشکیل دی جائیں۔
4. ہندوستان کے جن صوبوں میں مسلمان اقلیت میں ہیں، وہاں ان کے حقوق کو پورا تحفظ دیا جائے۔

علامہ اقبال کی مجلس شوریٰ

قرۃ العین ذیشان

علامہ محمد اقبال 3 ذیقعدہ 1294ہجری 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں شیخ نور محمد کے گھر میں پیدا ہوئے۔ شیخ نور محمد دین دار آدمی تھے، بیٹے کے لیے دینی تعلیم ہی کافی سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے اپنے بیٹے کو مولانا غلام حسن کے پاس پڑھنے بٹھادیا، علامہ اقبال جب سیالکوٹ میں پڑھتے تھے تو روزانہ صبح اٹھ کر نماز کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے، ان کے والد روزانہ صبح یہ منظر دیکھتے تھے، ایک صبح جب محمد اقبال تلاوت کر رہے تھے تو ان کے والد نے کہا" کبھی فرصت ملی تو تمہیں ایک بات بتاؤں گا۔" اقبال نے کئی مرتبہ بات بتانے کا تقاضا کیا مگر انہوں نے کہا، "جب امتحان دے لوگے تب بتاؤنگا۔" اور جب بچے نے امتحان دے دیا اور لاہور پہنچ گئے تو والد نے کہا" جب پاس ہو جاؤ گے تب بتاؤں گا۔" پھر جب محمد اقبال پاس ہوگئے تو پھر والد کو بات بتانے پر اصرار کیا تو والد نے کہا "بیٹا! جب تم قرآن پڑھا کرو تو یوں محسوس کیا کرو کہ جیسے اللہ تعالیٰ خود تم سے ہم کلام ہے۔"

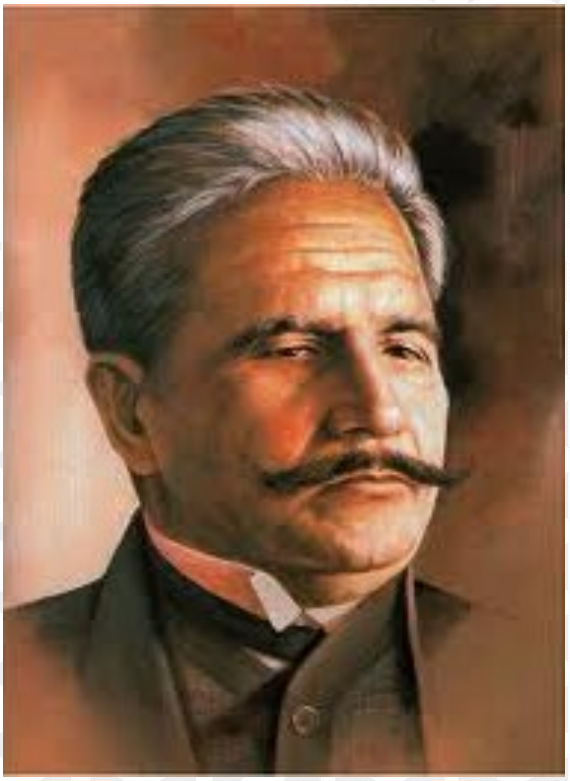

والد کا یہ فقرہ محمد اقبال کے دل میں اتر گیا اور پھر اس فقرے کی لذت انہوں نے زندگی بھر محسوس کی، جو ان کے کلام میں بھی نظر آتی ہے۔ محمد اقبال کو اپنے دین سے محبت بچپن ہی سے تھی، کہتے ہیں کہ جب وہ قرآن پاک کی تلاوت کرتے تھے تو اس قدر روتے کہ قرآن کے اوراق آنسوؤں سے تر ہو جاتے، تلاوت کرنے کے بعد آنسو سے تر ان اوراق کو دھوپ میں خشک کرنے کے لیے رکھ دیئے جاتے، علامہ محمد اقبال کا معمول بن گیا تھا کہ صبح جلدی بے دار ہوتے، علی بخش رات ہی کو ان کے لیے پانی کا لوٹا بھر کر رکھ دیتا، وہ صبح اٹھتے، وضو کرتے اور تہجد کی نماز ادا کرتے تھے، نماز میں بہت زیادہ خشوع خضوع ہوتا تھا، البتہ علالت کے

دنوں میں نماز میں یہ باقاعدگی نہ رہی تھی، لاہور میں بھاٹی دروازے میں قیام کے دنوں کا تذکرہ کرتے ہوئے، علامہ اقبال کے ملازم علی بخش کا کہنا ہے کہ:

''جن دنوں وہ بھاٹی دروازے میں قیام پذیر تھے۔ ایک بار پورے دو مہینے باقاعدگی سے تہجد کی نماز پڑھتے رہے، ان دنوں عجیب کیفیت تھی، قرآن کی تلاوت اس خوش الحانی سے کرتے کہ جی چاہتا سارے کام چھوڑ کر انہی کے پاس بیٹھا رہوں، اس زمانے میں کھانا پینا چھوٹ گیا تھا، حتیٰ کہ اکثر شام کے وقت صرف دودھ کا ایک گلاس پیتے تھے، خدا جانے اس میں کیا رمز پوشیدہ تھا۔''

علامہ محمد اقبال کو قرآن پاک سے کتنی محبت و تعلق تھا اس کا اندازہ صرف اس واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے کہ ایک دفعہ ایک ملاقاتی دیر تک اقبال سے ان کے فکر و فن کے بارے میں گفتگو کرتا رہا۔ پھر اچانک سوال کیا۔ ''علامہ آپ نے مذہب، سیاست، اقتصادیات، فلسفہ اور تاریخ پہ بہت سی کتابیں پڑھی ہیں، آپ کو سب سے بلند پایہ کتاب کون سی لگی؟'' اس سوال پر علامہ اقبال خاموشی سے اٹھے اور اندر چلے گئے، چند لمحوں بعد واپس آئے تو ایک کتاب سوال کرنے والے کے ہاتھ میں دے دی، ملاقاتی نے کتاب کھول کر دیکھی تو وہ قرآن مجید تھا۔ علامہ اقبال نے کہا، ''میں نے اس کتاب سے بلند پایہ اور کسی کتاب کو نہیں پایا۔''

علامہ محمد اقبال کو اپنے دینِ اسلام سے کتنی محبت و عقیدت تھی اس کا اندازہ ان کے ایک خط سے بھی بخوبی لگایا جاسکتا ہے جو انہوں نے اپنی چھوٹی بہن کو لکھا تھا۔ انہوں نے اپنے خط میں لکھا کہ: ''میں اپنی گزشتہ زندگی پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے بہت افسوس ہوتا ہے کہ میں نے اپنی عمر کا بیشتر حصہ یورپ کا فلسفہ پڑھنے میں ضائع کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے بہت اچھی ذہنی صلاحیتیں عطا فرمائی تھیں۔ اگر یہ صلاحیتیں دینی علوم پڑھنے میں استعمال کرتا تو آج اللہ تعالیٰ کے دین کی بہتر خدمت کر سکتا تھا، جب مجھے یہ یاد آتا ہے کہ والد محترم مجھے دینی علوم ہی پڑھانا چاہتے تھے تو مجھے اور بھی افسوس ہوتا ہے کہ اس کے باوجود کہ صحیح راہ معلوم تھی، مگر حالات نے اس راہ پر نہ چلنے دیا، بہر حال جو کچھ اللہ کے علم میں تھا، وہ ہوا اور مجھ سے جو کچھ ہو سکا، میں نے کیا ہے، لیکن دل چاہتا ہے کہ جو کچھ ہوا، اس سے بڑھ کر ہونا چاہیے تھا اور تمام تر زندگی نبی کریم ﷺ کی خدمت میں بسر ہونی چاہیے تھی۔'' ایک محفل میں علامہ اقبال سے کسی نے پوچھا، ''آپ عالم بھی ہیں اور فلسفی بھی، کیا آپ اللہ تعالیٰ کا وجود فلسفہ سے ثابت کر سکتے ہیں؟'' علامہ اقبال نے کہا، ''نہیں''

یہ سن کر اس شخص نے علامہ اقبال سے کہا، ''تو پھر آپ نے اللہ تعالیٰ کا وجود کیوں کر تسلیم کیا؟'' علامہ اقبال نے اس شخص کو جواب دیا، ''خدا کی ہستی ایک ایسی حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا، اس کے لیے کسی فلسفیانہ دلیل کی ضرورت نہیں، میرے نزدیک اللہ تعالیٰ کے ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ میرے پیغمبر ﷺ نے کبھی جھوٹ نہیں بولا، اس بات کو حضور اکرم ﷺ کے دشمن بھی مانتے تھے، جب رسول کریم ﷺ نے یہ فرمایا کہ اللہ تعالیٰ مجھ سے ہم کلام ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ یقیناً موجود ہے۔''

علامہ محمد اقبال کو اپنے دین سے کتنی محبت تھی اس محبت کا تعلق اس واقعہ سے بھی بیان ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ لندن میں گول میز کانفرنس کے ختم ہونے پر آپ مصر اور فلسطین کی سیاحت پر چلے گئے، واپسی پر ایک ملاقات میں اپنے دوستوں کو بتانے لگے۔ ''میں نے دورانِ سیاحت عیسائیوں اور یہودیوں کی عبادت گاہوں کو بطور خاصی دیکھا، ان عبادت گاہوں کو قریب سے دیکھنے پر معلوم ہوا کہ یہ عام طور پر تہہ خانوں میں بنائی گئی ہیں، جہاں اتنی تاریکی ہوتی ہے کہ ان میں بھی

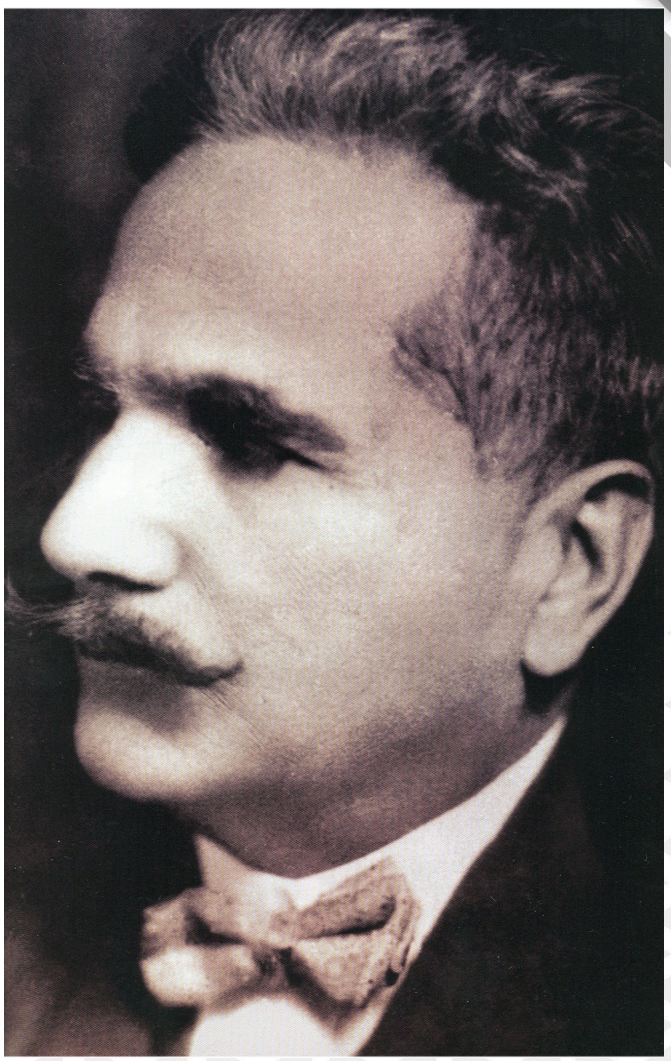

لیمپ روشن کرنے پڑتے ہیں، ان میں داخل ہوتے ہی اداسی، غم اور مایوسی کا اثر دل پر اس شدت سے پڑتا ہے کہ جسم کے اعضاء شل ہو جاتے ہیں۔ میں جب ان عبادت گاہوں کو دیکھنے کے بعد باہر نکلا تو میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا کہ اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے، جس نے انسان کو کھلی فضا، تازہ ہوا اور سورج کی روشنی میں عبادت کی تلقین کی ہے۔''

دیکھا جائے تو علامہ اقبال نے مغربی تہذیب کے مرکز لندن میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن مغرب کی اس چمک دھمک نے آپ کی طبیعت کو ذرا بھی متاثر نہ کیا، آپ کے گھر میں مستورات کے پردے کی خاص تاکید تھی، اس حوالے سے عظیم اسلامی مفکر سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں۔ ''ایک مرتبہ حکومت ہند نے انہیں جنوبی افریقہ میں اپنا نمائندہ بنا کر بھیجنا چاہا مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہیں کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو بھی ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے۔ اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے انکار کر دیا اور خود لارڈ ولنگنڈن (وائسرائے) سے کہا میں بے شک گناہ گار آدمی ہوں، احکام اسلامی کی پابندی میں مجھ سے بہت سی کوتاہیاں ہوئی ہیں، مگر میں اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کا حکم توڑ دوں۔''

اسپین کے شہر قرطبہ کی سیاحت کے دوران، علامہ اقبال مسجد قرطبہ دیکھنے گئے جو عیسائیوں نے قبضے کے بعد گرجا گھر میں تبدیل کر رکھی تھی، علامہ اقبال اس دردناک تبدیلی پر بہت افسردہ ہوئے، انہوں نے پادری سے کہا کہ وہ انہیں یہاں دو نفل پڑھنے کی اجازت دے۔ پادری سوچ میں پڑا تو علامہ اقبال نے اس سے کہا، ''تم عیسائی لوگ ہم مسلمانوں سے یہ سلوک روا رکھتے ہو جب کہ مسلمانوں نے تمہارے ساتھ کبھی ایسا سلوک روا نہیں کیا۔'' پادری علامہ کے اس فقرے سے بہت متاثر ہوا اور اس نے علامہ کو نفل پڑھنے کی اجازت دے دی۔ علامہ اقبال نے وہاں خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت نفل ادا کیے دعا مانگی اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد کیا۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے قبضے کے سات سو سال گزر جانے کے بعد علامہ اقبال وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس جگہ رب العالمین کے حضور سر جھکایا اور اسلام کی حقانیت کا اعلان کیا۔

شیخ نور محمد سیالکوٹ کے اکثر مقامی علماء کے ساتھ دوستانہ مراسم تھے، اقبال جب سن شعور کو پہنچے تو وہ انہیں مولانا غلام حسن کے پاس

لے گئے جو محلہ شوالہ کی مسجد میں درس دیا کرتے تھے، یہاں سے اقبال کی تعلیم کا آغاز ہوا، تقریباً سال بھر ہی ہوا تھا کہ شہر کے ایک نامور غلام مولانا سید میر حسن ادھر آ نکلے۔ ایک بچے کو پڑھتے دیکھا تو پوچھا کہ یہ کس کا بچہ ہے؟ معلوم ہوا تو وہاں سے اٹھ کر شیخ نور محمد کی طرف چل دیئے، دونوں ایک دوسرے کے قریبی واقف کار تھے، مولانا نے زور دے کہ سمجھایا کہ اپنے بیٹے اقبال کو مدرسے تک محدود نہ رکھو، اس کے لیے جدید تعلیم بھی بہت ضروری ہے انہوں نے خواہش ظاہر کی کہ اقبال کو ان کی تربیت میں دے دیا جائے، پہلے شیخ نور محمد کو پس و پیش رہا، مگر جب دوسری طرف سے اصرار بڑھتا چلا گیا تو اقبال کو مولانا سید میر حسن کے سپرد کر دیا، ان کا مدرسہ یا مکتب شیخ نور محمد کے گھر کے قریب ہی کوچہ میر حسام الدین میں تھا، یہاں اقبال نے اردو، فارسی اور عربی ادب پڑھنا شروع کیا، تین سال گزر گئے، اس دوران سید میر حسن نے اسکاچ مشن اسکول میں بھی پڑھنا شروع کر دیا۔ اقبال بھی وہیں داخل ہو گئے مگر پرانے معمولات اپنی جگہ رہے، اسکول سے آتے تو استاد کی خدمت میں پہنچ جاتے، میر حسن ان عظیم استادوں کی یادگار تھے جن کے لیے زندگی کا بس ایک مقصد ہوا کرتا تھا، علم حاصل کرنا اور علم پھیلانا، اس اچھے زمانے میں استاد مرشد ہوا کرتا تھا، میر حسن بھی یہی کیا کرتے تھے، تمام اسلامی علوم سے آگاہ تھے، جدید علوم پر بھی اچھی نظر تھی، میر حسن ادبیات، لسانیات اور ریاضیات میں مہارت رکھتے تھے۔

اسکاچ مشن اسکول سے اقبال نے 6 مئی 1893ء میں میٹرک فرسٹ ڈویژن سے پاس کیا، اور 1895ء میں اسکاچ مشن اسکول سے ہی ایف اے پاس کیا، مزید تعلیم کے لیے لاہور آ گئے اور یہاں کے گورنمنٹ کالج سے 1898ء میں بی اے پاس کیا، ان کے مضامین انگریزی، فلسفہ اور عربی تھے، انگریزی اور فلسفہ تو گورنمنٹ کالج میں

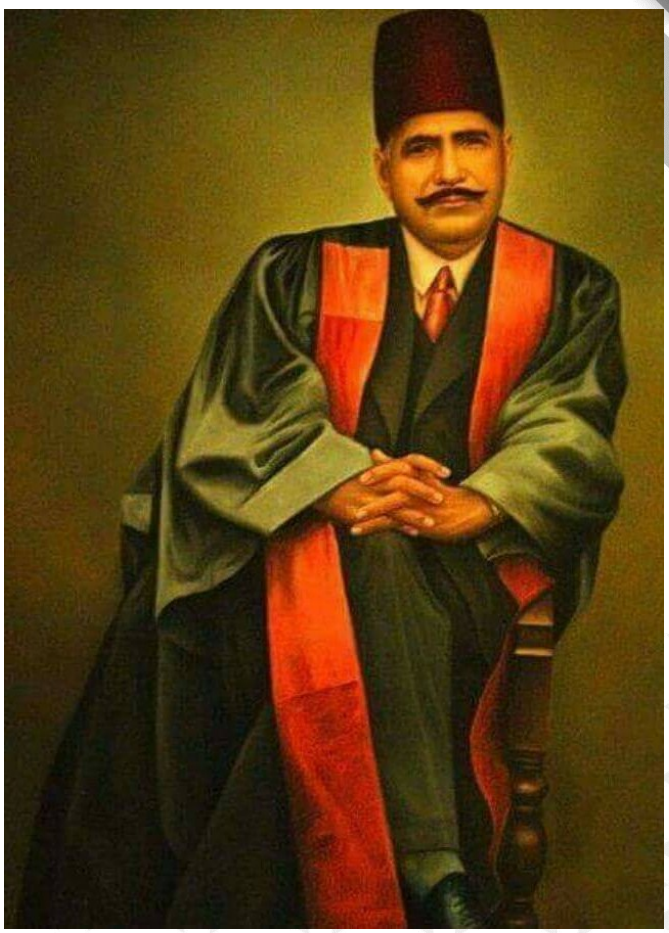

پڑھتے اور عربی پڑھنے اورینٹل کالج جاتے، اس وقت تک اورینٹل کالج گورنمنٹ کالج ہی کی عمارت کے ایک حصے میں قائم تھا اور دونوں کالجوں کے درمیاں بعض مضامین کے سلسلے میں باہمی تعاون اور اشتراک کا سلسلہ جاری تھا، بی اے کے بعد اقبال نے ایم اے فلسفہ میں داخلہ لے لیا، یہاں پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ کا تعلق میسر آیا، جنہوں نے آگے چل کر اقبال کی علمی اور فکری زندگی کا ایک حتمی رخ متعین کر دیا۔ مارچ 1899ء میں اقبال ایم اے میں پنجاب بھر میں اول آئے، اس دوران میں شاعری کا سلسلہ بھی چلتا رہا مگر مشاعروں میں شرکت نہ کرتے تھے، لیکن پھر نومبر 1899ء میں حکیم امین الدین کے مکان پر ایک محفل مشاعرہ منعقد ہوا، جس میں اقبال نے بھی غزل پڑھی جس کا ایک شعر تھا۔

موتی سمجھ کے شان کریمی نے چُن لیے،
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے۔

اس شعر پر اقبال کو بہت داد ملی، یہاں سے، بحیثیت شاعر اقبال کی شہرت کا آغاز ہوا۔

اسی زمانے میں انجمن حمایت الاسلام سے اقبال کا تعلق پیدا ہوا جو آخر تک قائم رہا، اس کے ملی اور رضاہی جلسوں میں اپنا کلام سناتے اور لوگوں میں ایک سماں باندھ دیتے، اقبال کی مقبولیت نے انجمن کے بہت سارے کاموں کو آسان کر دیا، ایم اے پاس کرنے کے بعد اقبال 13 مئی 1899ء کو اورنٹل کالج میں میکلوڈ عربک ریڈر کی حیثیت سے متعین ہو گئے، اسی سال پروفیسر آرنلڈ بھی عارضی طور پر کالج کے قائم مقام پرنسپل مقرر ہوئے، اقبال تقریباً چار سال تک اورنٹل کالج میں رہے، البتہ درمیان میں چھ ماہ کی رخصت لے کر گورنمنٹ کالج میں انگریزی پڑھائی، اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے کینیڈا یا امریکہ جانا چاہتے تھے مگر آرنلڈ کے کہنے پر انگلستان اور جرمنی کا انتخاب کیا، اورینٹل کالج میں اپنے چار سالہ دورِ تدریس میں اقبال نے اسٹیس کی، ''ارلی پلا تجنٹس'' اور واکر کی ''پولیٹیکل اکانومی'' کا اردو میں تلخیص و ترجمہ کیا، شیخ عبدالکریم الجیلی کے نظری توحید مطلق پر انگریزی میں ایک مقالہ لکھا اور ''علم الاقتصاد'' کے نام سے اردو میں ایک مختصر سی کتاب تصنیف کی جو 1904ء میں شائع ہوئی، 25 دسمبر 1905ء کو اقبال اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے اور کیمبرج یونیورسٹی ٹرنٹی کالج میں داخلہ لیا بعد ازاں بیرسٹری کے لیے لنکنز اِن میں داخلہ لے لیا، پھر جرمنی چلے گئے جہاں میونخ یونیورسٹی سے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ 1930ء میں الہ آباد میں آزاد اسلامی ریاست کا تصور پیش کیا اور 21 اپریل 1938ء کو وفات پا گئے۔ ■

علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی

شہناز اختر

شخصیات، ادوار کی پہچان ہوتی ہیں کسی ایک زمانے میں بسنے والے لوگ اس دور کا حوالہ بن جاتے ہیں کیونکہ لوگوں کا اسلوبِ فکر اور طرزِ عمل ایسے معاشرے کو تشکیل دیتا ہے جو اس دور کے رجحانات کی عکاسی کرتا ہے اگرچہ عوام و خواص ہر معاشرے کا حصہ ہوتے ہیں مگر فطرت کا ایک قانون تسلسل سے چلا آرہا ہے کہ ہر دور میں کچھ ایسی شخصیات ضرور موجود ہوتی ہیں جو انسانیت کا ناز اور قوموں کا فخر بن کر وقت کے ماتھے پر اپنا نام یوں ثبت کر دیتی ہیں کہ تاریخ انھیں کبھی فراموش نہیں کر پاتی۔

تیرھویں صدی میں مولائے روم کے بعد علامہ اقبال ہی وہ شخصیت ہیں جن کا سکہ مشرق تا مغرب، بلا امتیاز مذہب و قوم ہر جگہ چلتا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں اگر یہ کہا جائے کہ علامہ اقبال نایاب میں بھی نایاب تر تھے تو یہ قطعاً مبالغہ آرائی نہ ہو گی۔

علامہ اقبال محض ایک شخصیت نہیں بلکہ تاریخ کا ایک مکمل باب ہیں جو جامعیت اور ہمہ گیریت کو یوں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں کہ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ سادگی، سنجیدگی اور کم گو فطرت کے ساتھ علامہ اقبال ایک لطیف طبیعت کے مالک تھے مگر خاموشی کا عنصر طبیعت پر غالب تھا اور گھر میں عموماً آنکھیں بند کئے کسی سوچ میں مستغرق دکھائی دیتے۔ شاعری میں جھلکنے والی صاف گوئی اور نڈر پن کے برعکس ذاتی زندگی میں ان کا مزاج اظہار جذبات کے رجحان سے معدوم تھا یہی وجہ ہے کہ جاوید اقبال بیٹے کی نظر سے علامہ اقبال کی شخصیت کو بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زندگی میں شاذ و نادر ہی ایسا

موقع آیا ہو گا جب علامہ اقبال نے روایتی شفقت پدری کا اظہار کیا ہو۔ مگر اس سے یہ ہر گز مراد نہیں کہ وہ اولاد سے محبت نہیں کرتے تھے بلکہ مزاجاً وہ ایسی شخصیت کے حامل تھے کہ ان کا ہر رد عمل اور اظہار خاموشی کے اندر ہی پنہاں رہتا۔ گھر میں بچوں کو کھیلتا مسکراتا دیکھ کر مسکراتے تو بظاہر یوں لگتا جیسے انھیں کوئی مجبورا مسکرانے کو کہہ رہا ہو مگر یہ ساری سرد مہری ایک انسان کے آنے سے رخصت ہوتی اور وہ تھے مولانا محمد علی جوہر جو کئی کئی دن علامہ اقبال کے گھر آ کے ٹھہرتے اور ان کے قہقہوں سے گھر گونج اٹھتا اگرچہ بظاہر خاموش مگر گھریلو معاملات سے لا تعلق ہر گز نہیں تھے۔ بچوں کی تربیت کے لئے جہاں سختی کی ضرورت پڑتی وہاں سختی سے کام لیتے۔

جاوید اقبال سے ایک واقعہ منقول ہے کہ وہ ایک دفعہ وہ اپنے والد کے ساتھ شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی کے مزار پر حاضری کے لئے گئے۔ آپ نے قرآن کا ایک پارہ منگوایا اور تلاوت کرنے لگے۔ آپ کی آواز کی گونج سے مزار کی فضاء جاگ اٹھی اور جب آپ کے چہرے کی طرف دیکھا تو آنسوؤں سے چہرہ تر تھا۔

قرآن اور صاحبِ قرآن سے عقیدت اور انسیت کا جو تعلق علامہ اقبال کے ہاں دکھائی دیتا ہے وہ کسی پیمانے میں سما نہیں سکتا۔ قرآن سے آپ کا تعلق کبھی بھی محض قاری اور کتاب کا نہیں تھا بلکہ آپ کے اندر قرآن سے شغف، اور فکر و شعور کے ساتھ مطالعہ قرآن کا ایک والہانہ پن موجود تھا۔ آپ اپنا ایک واقعہ خود بیان کرتے ہیں کہ میں روزانہ نماز فجر کے بعد قرآن کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ والد صاحب دیکھتے تو پوچھتے کیا کر رہے ہو۔ میں ہر روز ایک ہی جواب دیتا اور وہ خاموشی سے چلے جاتے۔ ایک دن آپ نے والد صاحب سے سبب دریافت کیا کہ آپ ہر روز ایک ہی سوال کرتے ہیں میں ایک ہی جواب دیتا ہوں اور پھر آپ خاموشی سے چلے جاتے ہیں تو انھوں نے جواب دیا کہ تم قرآن پڑھتے ہو

تو یوں پڑھا کرو گویا قرآن اسی وقت نازل ہو رہا ہو اور گویا خدا تم ہی سے ہمکلام ہے۔ اقبال فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میں نے قرآن کو برابر سمجھ کے پڑھنا شروع کیا اور یوں ہی پڑھا گویا ابھی نازل ہو رہا ہو۔

اسی طرح اپنے ایک خط میں علامہ اقبال لکھتے ہیں کہ اب میں نے ساری کتب پڑھنا ترک کر دی ہیں سوائے دو کتب کے۔ ایک قرآن اور دوسری مثنوی مولانا روم۔

ذکر رسول ﷺ اور ذکر مدینہ پر بے قرار ہو جاتے۔ گویا تڑپ اٹھتے اور آنکھوں سے زار و قطار اشک رواں ہو جاتے۔ اپنے ایک شعر میں خدا کو مخاطب کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مکن رسوا حضور خواجہ مارا حساب من ز چشم او نہاں گیر اسی محبت کا ثمر تھا کہ آپ کا ہر لفظ، ہر شعر قلب و روح کو ایک آفاقی سوز و گداز اور جلا بخشتا ہے اسی صدق، عقیدت، محبت اور ایمان کا کمال ہے جس نے آپ کے کلام کو زندہ و جاوید کلام بنا دیا جو روحوں کو آب حیات کی طرح آبیار کرتا چلا جا رہا ہے۔

قرآن اور صاحب قرآن سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ قرآن کی تلاوت یا خاتم النبین صلی اللہ علیہ وسلم کا اسم گرامی سنتے ہی آنکھیں آنسوؤں سے لبالب ہو جاتیں۔ایک دفعہ سورۃ مزمل کی تلاوت سن کر اتنا روئے کہ تکیہ آنسوؤں سے تر ہو گیا۔ خود بھی خوبصورت لہن کے ساتھ قرآن پڑھتے۔

آپ تعلیم کے لیے انگلستان اور پھر جرمنی چلے گئے جہاں سے آپ نے فلسفہ میں پی ایچ ڈی کی اور مغربی معاشرت اور ذہنیت کو اتنے قریب سے دیکھا کہ روایتی مغرب پسندانہ سوچ سے کلیتا بیزار ہو گئے۔ جس کا تذکرہ جابجا آپ کے کلام میں نظر آتا ہے۔

اگرچہ سرسید نے مسلمانوں کو سیاست میں حصہ لینے سے منع کر رکھا تھا مگر تعلیم یافتہ طبقے میں سیاسی بیداری اور غلامی سے بیزاری اور آزادی کی آرزو انگڑائیاں لینے لگی تھی۔

1905ء میں تقسیم بنگال سے مشرقی و مغربی بنگال کی تشکیل عمل میں آئی تو مشرقی بنگال میں مسلمان اکثریت سے ان کی ترقی کے مواقع کھلنے کے آثار دکھائی دینے لگے۔ جس سے یہ خیال زور پکڑتا گیا کہ اگر مسلمانوں کو کچھ علاقوں میں اکثریت حاصل ہو جائے تو ان کی زندگی سہل ہو سکتی ہے مگر ہندوؤں نے احتجاج کر کے 1911ء میں تنسیخ تقسیم بنگال کروالی۔ یہ وہ موقع تھا جب اقبال نے وطنی قومیت کے جذبے کی کمی کو مسلمانوں میں محسوس کیا اور اس کا اظہار اپنے اشعار میں بھی کیا۔

آپ وہ پہلے شاعر تھے جس نے ہندوستان میں وطنیت کے جذبے کو فروغ دیا اور اس کا اعتراف خلیفہ عبدالحکیم نے یوں کیا کہ وطن پرستی کی تحریک ہندوؤں میں مسلمانوں سے قبل پیدا ہوئی مگر مسلمان قوم کوئی ایسا شاعر نہ پیدا کر سکی جو اس جذبے کو ابھارے مگر اقبال نے جب اپنے شاعرانہ کمال کو وطنیت کے لیے وقف کیا تو مسلمان کے علاوہ ہندو زیادہ متاثر ہوئے اور تب یہ نعرہ مقبول ہوا ''سارے جہاں سے اچھا ہندوستان ہمارا۔''

یہ علامہ اقبال کی سیاسی بصیرت اور دور اندیشی تھی کہ آزادی سے کم و بیش 17 سال قبل علی الاعلان اور بالعموم لندن سے 1908ء میں واپسی کے بعد سے ہی آپ نے مسلمانوں کے ہندوستان میں مستقبل کو دیکھ لیا تھا اور نہ صرف اس حقیقت کو سمجھا بلکہ اس حقیقت کے لیے مسلمانوں کو اپنے کلام سے آگاہ بھی کیا۔ عملی سیاست کے ذریعے بھرپور انداز میں اس بیانیے کے لئے جدوجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ 1930ء تک جو لوگ علامہ اقبال اور محمد علی جناح سمیت باقی علیحدہ پسند رہنماؤں کے مخالف تھے۔ 1937ء کے عام انتخابات کے بعد اس نظریے کے قائل ہونا شروع ہو گئے جس سے تحریک آزادی نے زور پکڑا اور 1947ء میں اقبال کا خواب پاکستان شرمندہ تعبیر ہوا۔ شاید یہی وہ خدمت تھی جس کا علامہ اقبال کے والد نے ان سے عہد لیا تھا۔ اور یہی وہ مقصد تھا جس نے علامہ اقبال کو ہندوستان کی زمین پر پیدا کیا تھا مگر امت مسلمہ کے لیے آپ کا خواب اور پیغام ابھی تک شرمندہ تعبیر ہونے کا منتظر ہے۔

تاریخ میں بہت ساری نامور شخصیات گزری ہیں مگر ان کو کسی ایک مذہب یا خطے کے لوگ پڑھتے ہوں گے مگر عالمِ اسلام کی چار ہستیاں ایسی ہیں جنھوں نے مشرق و مغرب کو اپنا گرویدہ بنایا ہوا ہے۔ وہ چار ہستیاں ہیں: امام غزالی، ابن العربی، مولانا رومی اور علامہ اقبال۔

اقبال کا فلسفہ خودی

سمیع اللہ

شاعر مشرق علامہ اقبال ایک ہمہ جہت شاعر ہیں بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہو گا کہ وہ محض ایک شاعر ہی نہیں، بلکہ عظیم مفکر اور فلسفی بھی ہیں۔اقبال ایک ایسے مفکر ہیں جنہوں نے زندگی کے مختلف اور متنوع مسائل پر برسوں مسلسل غور وفکر کے بعد اپنے کلام اور نثری مقالہ جات کے ذریعے ایسے پراز حکمت اور بصیرت افروز خیالات پیش کئے۔ جنہوں نے دنیا کے لوگوں کے دل ودماغ پر گہرے اثرات مرتب کیے۔ علامہ اقبال نے انسان کو خودی کے درس میں خود شناسی کا پیغام دیا ہے یعنی آدمی خود کو پہچانے، اپنی معرفت حاصل کرے اور یہ سوچے کہ اسے اللہ نے اس دنیا میں کیوں بھیجا ہے، اس نے کہاں جانا ہے؟اور یہ کس لئے آیا ہے، اس لئے اقبال کی خودی خود شناسی ہے، معرفت نفس ہے۔

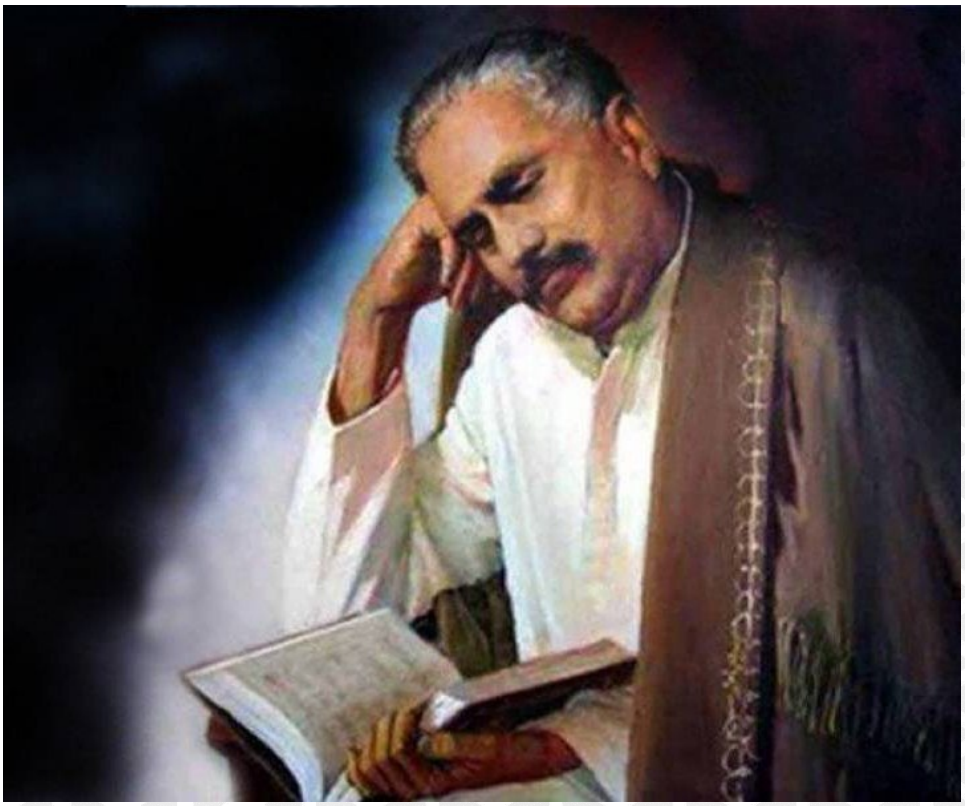

اقبال کے تصور خودی کا مطلب خودی ہے جیسا کہ انفرادیت اور کملیت دونوں میں ہے۔ اس کے لیے بامقصد عمل اور نفس کی مضبوطی کی ضرورت ہے یہاں تک کہ یہ انسانی وجود کی قدر کو اللہ کے قریب کر کے اسے وسعت دیتا ہے۔

”خود کو اتنا بلند کرو کہ خدا بھی تقدیر کے ہر حکم کو جاری کرنے سے پہلے تم سے پوچھے: بتاؤ تمہاری خواہش کیا

اقبال کے نزدیک خودی ہی سب کچھ ہے۔ انسانیت کے لیے آئیڈیل یونانی کلاسیکی یا تصوف کے کچھ حصوں کی طرف سے فروغ پانے والی خود نفی نہیں ہے، بلکہ خود اثبات ہے۔ ''وہ شخصیت کا خیال ہمیں قدر کا ایک معیار فراہم کرتا ہے: یہ اچھائی اور برائی کا مسئلہ حل کرتا ہے۔ جو نفس کو مضبوط کرتا ہے وہ اچھا ہے اور جو اسے کمزور کرتا ہے وہ برا ہے۔ فن، مذہب اور اخلاقیات کو شخصیت کے نقطہ نظر سے پرکھنا چاہیے۔''

ہے؟'' ڈاکٹر علامہ اقبال نے ان کا ذکر اپنے کلام میں جگہ جگہ نت نئے انداز سے کیا ہے۔

سر محمد اقبال (1877-1938) ایک مسلم شاعر، فلسفی، اور وکیل تھے جو سیالکوٹ، پنجاب، ہندوستان، اب پاکستان میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے فارسی اور اردو میں شاعری کی جو جدید دور کی عظیم ترین شاعری میں شمار ہوتی ہے۔ وہ اسلامی فلسفہ اور سیاسی فکر پر اپنے کاموں کے لیے بھی جانا جاتا ہے اور انھیں ہندوستانی مسلمانوں کے لیے ایک آزاد ریاست کے قیام کے خیال کا سہرا دیا جاتا ہے، جو ریاست پاکستان کے قیام کے تقریباً ایک دہائی بعد ان کے انتقال کے بعد عمل میں آیا۔ وہ علامہ اقبال کے نام سے مشہور ہیں جہاں علامہ کا مطلب عالم ہے۔

محمد اقبال کی فکر انسانی زندگی کی موروثی قدر اور مقصد پر مبنی ہے۔ ان کے فلسفے کا ایک مرکزی پہلو خودی یا خودی کا تصور ہے جو کہ قرآن میں روح (روح یا الٰہی چنگاری) کے تصور سے کسی حد تک مترادف ہے۔

اقبال نے خدائی صفات کو انسان کی شخصیت میں ضم کر کے خودی کو مضبوط کرنے کی تجویز پیش کی ہے۔ ان کا خیال ہے کہ قرآن میں انسان کے کردار کی واضح طور پر تعریف کی گئی ہے، جو کہتا ہے کہ ہماری مقدس فطرت خدا کی طرف سے آتی ہے جس نے ہم میں اپنی روح پھونکی ہے (دیکھیں، قرآن 15:29؛ 32:9؛ اور 38:72)۔

مزید برآں، ہم زمین پر خدا کے نمائندے بننے کے لیے بنائے گئے ہیں (دیکھیں قرآن 2:30، دیگر آیات کے ساتھ) اور اس طرح، ہم پر بڑی ذمہ داری ہے۔ انسانوں نے خوشی سے ایک امانت اور بوجھ کو قبول کیا جسے دیگر تمام مخلوقات نے رد کر دیا شخصیت کا اعتماد (قرآن 33:72)۔ زمین پر خدا کے نمائندے کے طور پر، ہمارے پاس بھی زبردست صلاحیت ہے اور یہ ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنی خودی کو مضبوط بنا کر اس صلاحیت کو عملی جامہ پہنائیں — جسے ہماری انفرادیت بھی سمجھا جاتا ہے۔

اقبال کے نزدیک خودی ہی سب کچھ ہے۔ انسانیت کے لیے آئیڈیل یونانی کلاسیکی یا تصوف کے کچھ حصوں کی طرف سے فروغ پانے والی خود نفی نہیں ہے، بلکہ خود اثبات ہے۔ ''وہ شخصیت کا خیال ہمیں قدر کا ایک معیار فراہم کرتا ہے: یہ اچھائی اور برائی کا مسئلہ حل کرتا ہے۔ جو نفس کو مضبوط کرتا ہے وہ اچھا ہے اور جو اسے کمزور کرتا ہے وہ برا ہے۔ فن، مذہب اور اخلاقیات کو شخصیت کے نقطہ نظر سے پرکھنا چاہیے۔''

اس تصور کی بنیاد پر اقبال کسی بھی فلسفے، نظام یا تصوف کی شکل کو رد کرتے ہیں جو خود کی تحلیل کو فروغ دیتا ہے۔ وہ اس قسم کی سوچ کے نتائج کو تباہ کن پاتا ہے اور اس کا خیال ہے کہ انا کو قتل کرنے کا خیال — بطور الٰہی خود — اس کمزوری اور جمود کی صورت میں نکلتا ہے جو

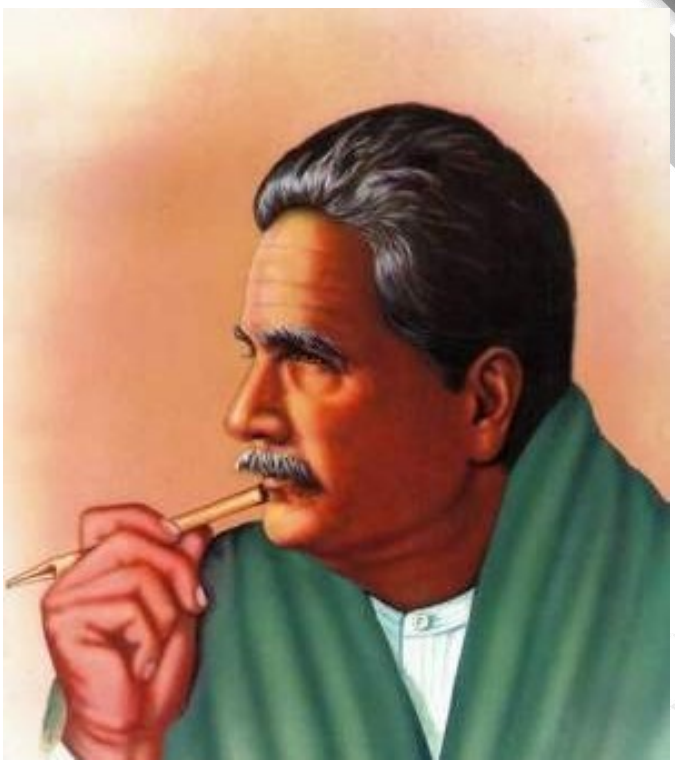

مردوں کے زوال کا سبب بنی ہے۔

قرآن کی انسانوں کو اپنی عقل استعمال کرنے کی ہدایت کی بنیاد پر اقبال کے خیال میں بھیڑ بکریوں کی طرح برتاؤ کرنا اور اپنے لیے سوچنے، فیصلہ کرنے اور عمل کرنے میں ناکامی بہت بڑی کمزوری ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ ''پوچھنا'' خود کو بہت کمزور کرتا ہے۔ مانگنے کا مطلب ہے کہ بغیر کسی مقصد، خواہش اور آدرشوں کو مسلسل تخلیق کیے بغیر، بے حسی کی حالت میں رہنا۔

اقبال کے خیالات براہ راست قرآن مجید سے آتے ہیں، جس میں کہا گیا ہے: ''خدا دو آدمیوں کی مثال دیتا ہے ایک گونگا، بے اختیار اور اپنے آقا کے لیے بوجھ: وہ جس کام کی طرف بھیجا جائے وہ کوئی فائدہ نہیں لاتا۔ کیا ایسے شخص کو انصاف کا حکم دینے والے اور ثابت قدم رہنے والے کے برابر قرار دیا جاسکتا ہے؟''

اقبال کے خودی کے تصور پر تنقید کی گئی ہے، اسے غلط سمجھا گیا ہے، اور یہاں تک کہ فرض کیا گیا ہے کہ اسے فریڈرک نطشے کے اوبرمین کے تصور سے مستعار لیا گیا ہے۔ تاہم، اقبالی اسکالرز نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یہ تقریباً یقینی طور پر مولانا رومی کی نثری تصنیف فی مافیہ سے نکلتا ہے۔

لفظ خودی کا مطلب ہے ''خود انحصاری، خود اعتمادی، خود، خود کی حفاظت، اور یہاں تک کہ جب ایسی چیز ضروری ہو، زندگی کے مفادات میں... سچائی، انصاف، اور فرض۔'' یہ خصلتیں اچھی ہیں کیونکہ یہ خود کو مضبوط کرتی ہیں، ''اسے سخت کرتی ہیں... تخریب اور تحلیل کی قوتوں کے خلاف۔'' مزید برآں، خودی کا مطلب خود علم، عکاسی، اور بامقصد عمل کے ذریعے اپنی قدر، قابلیت، اور صلاحیت کو حاصل کرنا ہے۔

مزید برآں، خودی کا مطلب خود علم، عکاسی، اور بامقصد عمل کے ذریعے اپنی قدر، قابلیت، اور صلاحیت کو حاصل کرنا ہے۔ اقبال کی شاعری میں طاقتور منظر کشی ہے تاکہ قارئین میں ان کے مضبوط خودی کے خیال کو واضح طور پر متاثر کیا جاسکے۔ عقاب ایسی ہی ایک مثال ہے:

''دنیا میں عقاب کی طرح جیو اور عقاب کی طرح مرو۔''

عقاب مطلوبہ خصوصیات کی علامت ہے جیسے ہمت، آزادی سے محبت، تیز بصارت، عمل، تیز حرکت اور آسمانوں پر حکمرانی کرنے کی صلاحیت۔ تاہم، خود کا ایک مضبوط احساس ظلم یا خود غرضی کے ساتھ الجھنا نہیں ہے، بلکہ خود شناسی، انصاف، جیونت اور انفرادیت کی اعلیٰ ترین ڈگری کے ساتھ ہے۔

اقبال پر رومی کا اثر اچھی طرح سے دستاویزی اور واضح ہے اور ''اقبال کے تاثرات قاری کو رومی کے بعض اقوال کی سختی سے یاد دلاتے ہیں۔'' فی مافیہ سے:

''مولانا ایک بادشاہ کے بارے میں بتاتے ہیں جس نے اپنے بیوقوف بیٹے کو علم نجوم، جیومنسی اور دیگر خفیہ علوم کی تعلیم دی تھی، اور

پھر اس سے کہا تھا کہ وہ بتائے کہ اس نے اپنی مٹھی میں کیا چھپا رکھا ہے۔ لڑکے نے شے کی خصوصیات کو زرد، کھوکھلی اور گول کے طور پر بیان کیا اور پھر یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ چکی کا پتھر ہونا چاہیے۔ چنانچہ مولانا فرماتے ہیں کہ زمانے کے علماء ہیں۔ وہ تمام تفصیلات جانتے ہیں اور اصل نفس کو بھول جاتے ہیں- اور یہاں وہ خودی کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ یہی خودی باقی رہتی ہے جب گول، کھوکھلی، سنہری انگوٹھی کی تمام صفات مصلوب میں غائب ہو جاتی ہیں۔ اقبال کو اس عبارت کا علم تھا یا نہیں— یہ دیکھنا ضروری ہے کہ رومی نے خودی کی اصطلاح کو انسان کی روحانی، غیر فنا ہونے والی ذات کے معنی میں استعمال کیا تھا۔'' ■

سیہون کا سخی قلندر

محمد سلمان

صوفی کے نام سے جڑا تیسرا لقب ہے۔

قلندر: محمد حسین بن خلف تبریزی، مصنف فارسی کی ایک مشہور لغت میں قلندر کی تعریف اس طرح کی

''اس قدر روحانیت ہے کہ وہ سماجی اور روایتی پابندیاں اور ممنوعات کی قیود سے آزاد ہے'' (محمد،1978، صفحہ 7)۔

قلندر لقب کا تعلق تین اولیاء سے رہا ہے۔

شہباز، پانی پت کے بزرگ بو علی شرف الدین اور ایک خاتون سنت رابعہ بصری (محمد،1978)۔

قلندر کی اصطلاح فقیروں یا ملنگوں، صوفی مریدوں سے بھی جڑی ہوئی ہے۔ انہیں سفر کرنے والے درویشوں کے طور پر سمجھا جاتا ہے اور عام طور پر کسی خاص ترتیب سے وابستہ نہیں ہوتے ہیں۔ تاہم سہون میں رہنے والوں کا تعلق لعل شہباز قلندر سے ہے۔ یہ فقیر اور ملنگ اب سیہون میں لعل شہباز قلندر کے مزار کے قریب سکندر بودلہ بہار کے مزار کے ساتھ رہائش پذیر ہیں۔ بودلہ بہار کو لعل شہباز قلندر کے سب سے وفادار شاگرد کے طور پر جانا جاتا ہے۔

مسلم بادشاہ فیروز شاہ تغلق، 1357ء میں (قاضی، 1971)۔ پرجوش دھمال کو لعل شہباز قلندر کے لیے خدا کا تحفہ سمجھا جاتا ہے جس کی وجہ سے انھیں عرفان میں بلند مقام حاصل ہے۔ لعل شہباز قلندر کے مزار اور ان کے شاگرد بودلہ بہار کے مزار پر ڈھول کی تھاپ پر دھمال کا سلسلہ آج بھی جاری ہے۔

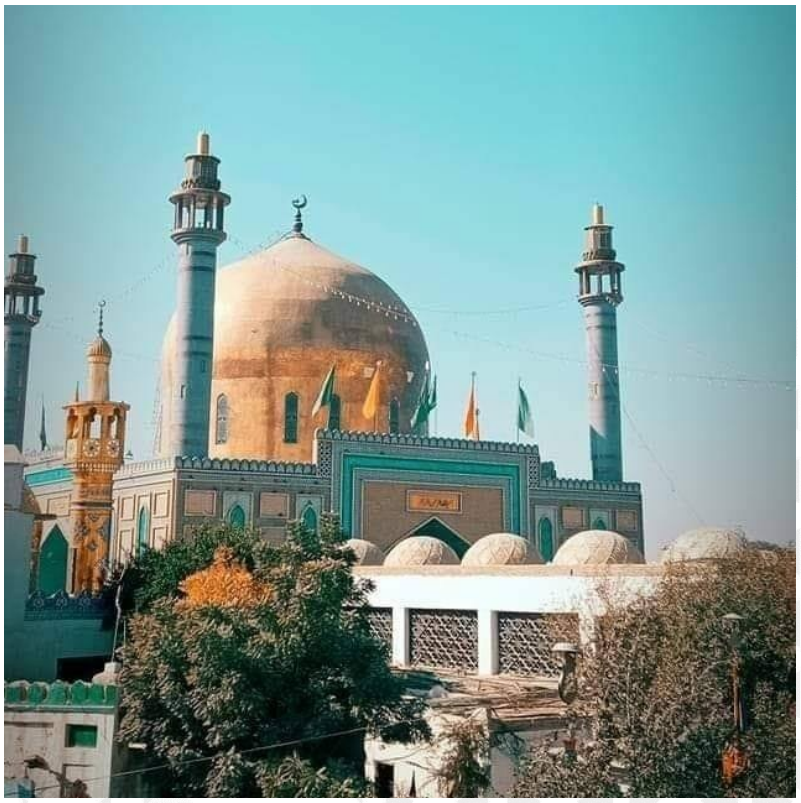

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ، چیف سیکریٹری سہیل راجپوت اور دیگر، سیکریٹری یونیورسٹی اینڈ بورڈز مرید رحیمو، سیکریٹری آئی ٹی آصف اکرام اور ٹیک ویلی اور گوگل پاکستان عمر فاروق کے ساتھ ایم او یو پر دستخط کی تقریب میں موجود ہیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے وزیر اعلیٰ ہاؤس میں انٹرنیشنل اومبڈسمین انسٹی ٹیوٹ/ محتسب ویسٹرن آسٹریلیا مسٹر کرس فیلڈ سے ملاقات کی۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ وزیراعلیٰ ہاؤس میں صوبائی محتسب کی جانب سے تھرپارکر میں
اسٹنٹنگ کی تشخیص کے حوالے سے اسٹڈی رپورٹ کی رونمائی کی تقریب سے خطاب کررہے ہیں۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے وزیراعلیٰ سندھ میں منعقدہ پروگرام میں سندھ پریمیئر لیگ کی آفیشل شرٹ کی رونمائی کرتے ہوئے۔

پاکستان پیپلز پارٹی کے چیئرمین اور وزیر خارجہ بلاول بھٹو زرداری کورنگی میں
ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکولر ڈیزیز کے سنگ بنیاد کی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ کورنگی میں ذوالفقار علی بھٹو انسٹی ٹیوٹ آف کارڈیو ویسکولر ڈیزیز
کے سنگ بنیاد کی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیراعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ حضرت لعل شہباز قلندر کے مزار پر حاضری دیتے ہوئے۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے پیپلز پارٹی سندھ کی میزبانی میں
7ویں ڈیجیٹل مردم شماری کے حوالے سے کثیر الجماعتی کانفرنس میں شرکت کی۔

مزاریں ایسی جگہیں ہیں جہاں رسومات کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے اور انسانوں کے ساتھ ان کے پیچیدہ تعلقات میں مطالعہ کیا۔ یہ خالی جگہوں کو دیگر خالی جگہوں کے سلسلے میں مقدس سمجھا جاتا ہے۔

جو بڑے سماجی ڈھانچے میں موجود ہیں۔ میر سیا ایلیاڈ (1959) کے درمیان بائنری تعلق کی وضاحت کرتا ہے۔ مقدس مقامات وہ مقدس مقامات ہیں۔ جن کے لیے وجود یا وجود کی دو حالتیں ہیں۔ لوگ ایک مذہبی شخص کے لیے، مقدس جگہ خاص ہوتی ہے۔ حد یا حد جو فرق کرتی ہے اور مخالفت کرتی ہے۔ دو دنیا. عام طور پر ایک نشانی کے مقدس ہونے کی نشاندہی کرتا ہے۔ جگہ، جیسے ایک مزار کا گنبد اگر نشانی ظاہر نہ ہو۔ اسے پکارا جاتا ہے، جیسے مزار ایک تدفین کی جگہ کے گرد بنایا گیا ہے۔

لہذا، ایک جگہ کو مقدس کرنے کے لئے تکنیک موجود ہیں. مقدس مقامات کو دنیا کا مرکز سمجھا جاتا ہے (ایلیڈ، 1959)۔ ایک مذہبی شخص کے لیے مقدس اوقات ہوتے ہیں۔ ٹھیک ہے، جیسے ایک تہوار کا وقت، جو وقت کی نمائندگی کرتا ہے۔ جس کو مقدس کیا گیا ہے۔ مقدس وقت ''غیر معینہ مدت تک'' ہے۔ قابل بازیافت اور غیر معینہ مدت تک دہرایا جا سکتا ہے''کیونکہ ہر مذہبی تہوار کی ''دوبارہ حقیقت پسندی'' کی نمائندگی کرتا ہے۔ مقدس واقعہ جو ایک افسانوی ماضی میں ہوا (ایلیڈ، 1959، صفحہ 69-71)۔ میلے کے شرکاء بن جاتے ہیں۔ افسانوی واقعہ کے ہم عصر۔ سے ابھرتے ہیں۔ (ایلیڈ، 1959)۔

سہون میں اپنے دوروں کے دوران میں نے مزار کی ثقافت کو سمجھنے کے لیے شرکاء کے مشاہدے کے طریقہ کار کو اپنے بنیادی آلے

کے طور پر استعمال کیا۔ شرکت کنندگان کے مشاہدے کا طریقہ ایک محقق کو تحقیقی مقام پر ہونے والی سرگرمیوں کی ایک وسیع صف سے آشنا کرتا ہے۔ لعل شہباز قلندر کے عرس میں میں نے ایسی سرگرمیوں، رسومات اور تقریبات کا مشاہدہ کیا جو نہ صرف عرس بلکہ سہون کے مزار اور ثقافت سے بھی وابستہ تھے۔

شرکاء کے مشاہدے کے طریقہ کار میں، یہ اہم ہے۔ شمولیت کی سطح کا ذکر کرنا۔ زیادہ تر محققین جو فیلڈ میں سالوں کی سرمایہ کاری کریں خود کو مکمل طور پر غرق کریں۔ مقامی ثقافت اور طرز زندگی۔ وسرجن کی یہ سطح بہت سے عوامل پر منحصر ہے جیسے ''ظہور، زبان، کلاس، پس منظر، انداز، بات چیت میں آسانی انداز، عمر، سائز، جنس، نسل اور نسل'' (Schensul) شینسول اینڈ لی کومپٹے، 1999، صفحہ 93)۔ اگرچہ ثقافتوں کے اندر پاکستان مختلف خطوں میں مختلف ہے، وہ سب اس کے تحت آتے ہیں۔ ایک عام قومی ثقافت کی چھتری۔ جیسے عوامل قومی زبان میں روانی نے میرے فائدے میں کام کیا۔ پاکستان کا شہری ہونے کے ناطے رسم ورواج سے آگاہ ہوں۔ مزار کی ثقافت کے عمومی آداب نے مجھے اندر رکھا سیہون ایک محقق کی حیثیت سے مضبوط پوزیشن میں ہے۔

عرس کے دوران میں نے پورے شہر اور اس کی بیرونی حدود تک پھیلنے کا مشاہدہ کیا۔ چونکہ میں عرس کے دوران سہون سے باہر رہتا تھا، اس لیے اس نے مجھے شہر کے باہر اور اندر سے بہت سے مقامات سے میلے کی وسعت کو دیکھنے کی آزادی دی۔ میں نے تین روزہ فیسٹیول کے دوران شہر میں ہونے والی مختلف سرگرمیوں کا مشاہدہ کرتے ہوئے شہر کا چکر لگایا۔ میں نے بھی عرس کے دوران سہون میں دو راتیں صبح سویرے تک گزاریں خاص طور پر صبح اور رات کی سرگرمیوں کو نوٹ کرنے کے لیے۔

شرکاء کے مشاہدے کے علاوہ، میں نے کیا تحقیقاتی اوپن اینڈ انٹرویوز کے ساتھ ساتھ کچھ غیر رسمی۔

انٹرویوز غیر ساختہ استعمال کرنے کا مقصد لیکن تحقیقاتی انٹرویوز ''ڈومینز کو تلاش کرنے کے لئے یقین رکھتے تھے مطالعہ کے لیے اہم ہو'' تلاشی فطرت نے مجھے ایک محقق کے طور پر رکھنے میں مدد کی۔ ذہن میں کچھ اہم ڈومینز اور اوپن فارمیٹ نئے اور غیر دریافت شدہ ڈومینز کو دریافت کرنے کے لیے لچک کی اجازت دی۔ کچھ اہم ڈومینز کا حصہ رکھنے کے لیے قدرتی گفتگو، ایک انٹرویو گائیڈ جس میں کلید شامل ہے۔ سوالات نے مجھے کئی مسائل پر توجہ مرکوز رکھنے میں مدد کی۔ بات چیت کے بہاؤ کو برقرار رکھیں. میں نے ایک لوک صوفیانہ کلام گلوکار کا انٹرویو کیا جو اس سید کے گھر عرس کے دوران ان کی طرف سے منعقدہ ایک تقریب میں گا رہا تھا۔ میرے کہنے پر وہ سائیڈ کے ایک کمرے میں آئے جہاں کچھ اور مہمان بھی بیٹھے ہوئے تھے اور میں نے انٹرویو لیا۔ سید نے ایک فقیر اشرف سے رابطہ قائم کرنے میں بھی میری مدد کی۔ میں نے اپنے پہلے دورے پر اشرف کا تفصیلی انٹرویو ان کے اپنے گھر پر کیا جو بودلہ بہار کے مزار سے متصل ایک پرسکون جگہ ہے۔ میں نے ان کے ساتھ ان کے کام کی جگہ پر ایک اور انٹرویو سیشن بھی کیا، مزار کے ایک چھوٹے سے کونے میں جہاں وہ مزار میں داخل ہونے سے پہلے لوگوں کے جوتے جمع کرنے کا معمولی کام انجام دیتے ہیں۔ 110 فارن ہائیٹ کی شدید گرمی میں، میں اور میرے معاون نے دوسرے فقیروں اور ملنگوں کے ساتھ کھانا کھایا، ہمیں فقیر طرز زندگی کے تجربے میں غرق کر دیا۔ میں نے اس کے ساتھ ایک تعلق پیدا کیا، جو ضروری عناصر میں سے ایک سمجھا جاتا ہے۔

دھمال پرفارمنس سارا سال شام کے ساتھ ساتھ لعل شہباز قلندر اور بودلہ بہار کے مزاروں پر عرس کے دوران ہوتی ہے۔ اس کا

آغاز بودلہ بہار کے مزار پر ایک چھوٹی سی تقریب سے ہوتا ہے جیسے ہی شام کی اذان ختم ہوتی ہے۔ ملنگ اپنے سرخ لباس میں جمع ہوتے ہیں اور ڈھول کی تھاپ پر دھمال پیش کرتے ہیں۔ وہ اپنے ہاتھ اور پاؤں، ایک ایک وقت میں، ایک تال میں آگے اور پیچھے حرکت کرتے ہیں۔ وہ قدم جاری رکھتے ہیں اور تھوڑی دیر کے بعد، ڈھول کی تیز تھاپ سے اشارہ ملنے پر، وہ چکر لگاتے ہیں۔ یہ سارا عمل چند بار دہرایا جاتا ہے جس کے بعد بودلہ بہار پر دھمال ختم ہوتی ہے۔ ملنگوں کے علاوہ کچھ مرد اور خواتین بھی دھمال میں حصہ لیتے ہیں لیکن ابتدا بودلہ بہار کے مزار پر ملنگ ہی کرتے ہیں۔ اس کے دوران ایک شخص بلند آواز میں علی یا قلندر کی مدح سرائی کرتا ہے جس کا باقی تمام لوگ مناسب جواب دیتے ہیں۔ نعرہ کے نام سے جانے والے ان نعروں کے معیاری الفاظ ہوتے ہیں اور کہا جاتا ہے کہ معیاری جوابات نکلتے ہیں جیسے ایک پکار نعرہ حیدری ہے اور معیاری جواب یا علی (اے علی) ہے۔ یہ دونوں مزارات پر عام رواج ہے۔

جب بودلہ بہار پر شام کی دھمال ختم ہوتی ہے تو لعل شہباز قلندر کے مزار پر ایک اور بڑا دھمال شروع ہوتا ہے۔ ہر کوئی اس مزار پر دھمال کرتا ہے، کیونکہ جگہ بڑی ہے۔ شام کا دھمال شروع ہوتے ہی مزار کا صحن لوگوں سے بھر جاتا ہے۔ مرد شرکاء صحن کے زیادہ تر حصے پر قابض ہیں جبکہ خواتین عقیدت مندوں کے لیے مخصوص جگہیں مختص ہیں۔ کچھ مرد اراکین خواتین شرکاء کے لیے مختص علاقوں کی حفاظت کرتے

ہیں۔ وہ دوسرے مرد اراکین کو دور کر دیتے ہیں جو پرفارم کرنے والی خواتین کو گھورتے ہیں۔ وہ لوگوں کو دھمال کرنے والی خواتین کی تصاویر لینے سے بھی روکتے ہیں۔

تمام طبقوں میں توانائی زیادہ ہے کیونکہ لوگ مل کر لال شہباز قلندر کی ایک مشق کو یاد کرتے ہوئے دھمال کرتے ہیں۔ لوگ اپنے ہاتھوں کو ہوا میں اٹھا کر، آنکھیں بند کر کے، اور اپنے سروں کو ڈھول اور شہنائی کی تھاپ پر آگے پیچھے کر کے دھمال پیش کرتے ہیں، یہ برصغیر کا ہوا کا آلہ ہے جو زیادہ تر شادیوں میں بجایا جاتا ہے۔ کچھ مرد اور عورتیں ٹرانس کی حالت میں پہنچتے دکھائی دیتے ہیں۔ ایسا اس وقت ہوتا ہے جب وہ اپنے آپ پر قابو کھو دیتے ہیں اور اپنے جسم کو معمول سے زیادہ تیزی سے آگے پیچھے کرنا شروع کر دیتے ہیں جبکہ اپنے سر کو بھی تیزی سے آگے پیچھے کرتے ہیں۔ ٹرانس کی اس حالت کو حل کہتے ہیں۔ چند منٹوں کے بعد، زیادہ تر لوگ جو ہال کی حالت کا تجربہ کرتے ہیں وہ ختم ہو جاتے ہیں۔ ان کے خاندان یا دوست پھر ان کا خیال رکھتے ہیں۔ اگر عورت بے ہوش ہو جائے تو وہ صحن کے ایک طرف لے جایا گیا۔ جو انچارج ہیں۔ لوگوں کو منظم کرنے والے احترام کی حفاظت کے لئے انتہائی احتیاط سے کام لیتے ہیں۔ اور خواتین اداکاروں کا اعزاز۔

عرس کے دوران عقیدت مندوں کی تعداد اس جگہ کی توانائی کے ساتھ کئی گنا بڑھ جاتی ہے۔ دھمال نہ صرف شام میں بلکہ فجر کے وقت بھی ادا کی جاتی ہے۔ دھمال کے یہ دو واقعات عرس کی سب سے بڑی تقریبات ہیں۔ دھمال کا حصہ بننے کے لیے ملک کے اندر اور باہر سے لوگ دور دور سے آتے ہیں۔ دھمال عام طور پر مزار کی جگہ پر ادا کی جاتی ہے، لیکن عرس کے دوران مزار کی جگہ وسیع ہوتی دکھائی دیتی ہے کیونکہ عقیدت مند شہر کے مختلف کونوں اور کونوں میں جمع ہوتے ہیں اور پرفارم کرتے ہیں۔ ان چھوٹے اجتماعات میں زیادہ تر مرد اراکین پر

مشتمل ہوتے ہیں اور بعض صورتوں میں خواجہ سرا بھی شرکت کرتے ہیں۔ مجھے شہر کی ایک تنگ گلی میں ایک چھوٹا سا اجتماع ملا جہاں خواتین ارکان کا ایک گروپ دھمال کر رہا تھا لیکن مرد ارکان نے ان کی بہت زیادہ حفاظت کی۔ کارکردگی کے علاقے کے قریب جانے کی کوشش کرنے والے کسی بھی غیر متعلقہ شخص کو وہاں سے چلے جانے کو کہا گیا۔

لعل شہباز قلندر کا یوم وفات تصوف کی ایک منفرد ثقافتی گفتگو تخلیق کرتی ہے۔ سہون میں ہزاروں لوگ حاضرین کے لیے شہر کی جگہ پر جمع ہوتے ہیں۔ ان کے سرپرست قلندر کو خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ چھوٹا شہر ایک تہوار کی جگہ میں جہاں روحانی، ثقافتی، سماجی اور تجارتی سرگرمیاں فروغ پاتی ہیں۔ کے اس جگہ کی کشش کا مرکز لعل شہباز قلندر کا مزار ہے۔ یہ مزار سیہون شہر کا سب سے مقدس مقام ہے جہاں عقیدت مندوں کے لیے پرجوش رقص، دھمال سمیت بہت سی رسومات ادا کی جاتی ہیں۔ زائرین ڈھول کی تھاپ پر رقص کر کے اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ ■

عالمگیریت تاریخی عمل کا تسلسل

سید عامر حسین

عالمگیریت تاریخی عمل کا تسلسل ہے۔آج عالم گیریت کی منزل تک پہنچنے میں بڑی رکاوٹ غلبے کی خواہش، جنگ کو امن کا وسیلہ قرار دینے کی حکمت عملی، اسلحے کی منافع بخش صنعت، اور قانون کی حکمرانی اور عوام کی خوشحالی کی جگہ ملکی سلامتی اور قومی مفادات کی ترجیح ہے۔ عالمگیریت کے قیام کے لیے باہمی احترام، اعتماد اور امن پر ایمان لازمی ہے۔

عام طور پر گلوبلائزیشن کی بات کی جاتی ہے۔عالمگیریت کی۔دنیا کو کہا جاتاہے کہ یہ گلوبل ولیج، عالمگیر گاؤں بن گئی ہے۔

اسلامی روایت میں سفر کا زندگی اور دین سے گہرا رشتہ ہے۔ اس رشتے کی اہمیت کے لیے یہی گواہی کافی ہے کہ شریعت، سیرت، طریقت، مذہب، مسلک، صراط مستقیم جیسے دین کے اہم حوالوں میں راستہ کا طبعی تصوراور مذہبی تخیل مشترک ہے۔ سب زندگی گزارنے کے راستے ہیں۔ سبھی سفر کے استعارے ہیں۔ قرآن کریم نے سیر وا فی الارض کی دعوت دی اور زمین کی سیر وسیاحت کا حکم دیاتو جغرافیہ تاریخ کے اوراق بن گیا۔

نبی کریم ﷺ کے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ تک سفر ہجرت نے دین کی دعوت کے عالمگیر تخیل کو مستحکم کیااور دنیا کی تاریخ بدل دی۔ سیرت النبی کا یہ عمل فقہ اسلامی کا ایک اہم موضوع بن گیا۔

سفر علم کے حصول کے لیے ہو تو رحلہ فی طلب العلم، اور بیت اللہ کا عزم ہو تو حج کہلائے، اور دونوں فرض قرار دیے گئے۔ مسافر ابن السبیل کہلایا۔ سفر کی سختیوں میں عبادات کے احکام میں رعایات دی گئیں۔

اردو ادب کی تقریباً سبھی اہم نثری و شعری اصناف پر مختلف پہلوؤں سے کثیر اور وقیع تحقیقی و تنقیدی کام ہو چکے ہیں اور موجودہ عہد میں بھی کسی نہ کسی شکل میں ان اصناف پر کام جاری ہے۔ سفر نامہ کی صنف بھی اپنی ایک مستقل حیثیت رکھتی ہے اور اس پر اردو میں خاصا وقیع سرمایہ موجود ہے۔ اس موضوع پر جو تحقیقی کام ہوئے ہیں ان کی اہمیت مسلم ہے، لیکن یہ کام ابھی تشنہ ہیں۔ جبکہ اسی صنف کی ایک ذیل قسم حج کے سفر نامے ہیں، جن کی تعداد سیکڑوں تک پہنچتی ہے اور یہ بھی اردو ادب کا گراں قدر سرمایہ ہیں، لیکن اس موضوع پر تاحال کوئی باقاعدہ اور مستقل تحقیقی کام نہیں ہوا ہے۔ عام سفر ناموں پر ہندستان میں ڈاکٹر قدسیہ قریشی، ڈاکٹر خالد محمود اور ڈاکٹر بشریٰ رحمن نے اور پاکستان میں ڈاکٹر مرزا حامد بیگ اور ڈاکٹر انور سدید وغیرہ نے کام کیا ہے اور ان کے مقالات کتابی شکل میں شائع بھی ہو چکے ہیں، جن کی بدولت اس صنف کی حیثیت خاصی حد تک نمایاں ہوئی ہے۔

حج کے سفر نامے مختلف مقاصد کے تحت لکھے جاتے ہیں۔ ایک مسلمان جب حج کر کے واپس آتا ہے تو اس کے دوست واحباب اور اس کے گھر والے اس بات کے شدید مشتاق رہتے ہیں کہ اس نے کیسے حج کیا، اس سفر کے دوران اس نے کیا دیکھا، مکہ و مدینہ میں واقع مقدس

مقامات کو دیکھ کر، خاص طور سے خانۂ کعبہ کو پہلی بار دیکھ کر اور روضۂ رسول پر پہنچ کر آپ ﷺ پر درود وسلام کے وقت اس کے اوپر کیا کیفیت طاری ہوئی، ان چیزوں کو دیکھ کہ اس کے اندر کون سے احساسات وجذبات پیدا ہوئے، ان سب چیزوں کو حاجی ان سے بیان کرے۔ ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حاجی اپنے سفر کی روداد کو صفحۂ قرطاس پر بیان کرتا ہے۔ حج کے سفرناموں کے لکھنے کا ایک دوسرا مقصد دوسرے عازمین حج کی رہنمائی کرنا ہوتا ہے۔ ایسے سفرنامے جو اس مقصد کے تحت لکھے جاتے ہیں ان کی حیثیت ایک گائیڈ بک کی ہوتی ہے۔ کبھی کبھی حاجی اپنے شوق اور خواہش کی تکمیل کے لئے اپنے حج کے سفر کی روداد کو تحریر کرتا ہے۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ دوسرے لوگ اس سفرنامہ کو پڑھ کر حج کے لئے آمادہ ہوں۔

انیسویں صدی کے اکثر حج کے سفرنامے عازمین حج کی رہنمائی کی غرض سے لکھے گئے تھے۔ ان میں ریل کے سفر، اسٹیشنوں کے نام جدہ بندرگاہ و جہاز کے حالات و مسائل کا تفصیلاً ذکر کیا گیا ہے۔ کسی کسی سفرنامۂ حج میں حجاز کی تاریخ و جغرافیہ

اور وہاں کی تہذیبی وثقافتی زندگی کو بھی پیش کیا گیا ہے۔اس دور کے حج کے سفر ناموں میں فنی اور ادبی اعتبار سے ایک کمی بھی پائی جاتی ہے کہ اس عہد کے سفر نامہ نگار اپنے داخلی جذبات و مشاہدات کو اپنے سفر ناموں میں پیش کرنے سے قاصر رہے۔ ان کا اسلوب نگارش بھی قدیم تھا۔ کسی کسی لفظ کے املا میں بھی قدیم طرز کو اختیار کیا گیا۔

''اپنے گھر سے بیت اللہ تک'' حج کا یہ سفر نامہ مشہور عالم دین مولانا سید ابوالحسن ندوی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ مولانا نے ۱۹۴۷ء میں حج کی سعادت حاصل کی تھی۔ حج سے واپسی کے دو سال بعد ۱۹۴۹ء میں یہ سفر نامۂ حج ''الفرقان'' لکھنؤ کے حج نمبر میں شائع ہوا۔ اسی سال مجلس نشریات اسلام کراچی سے بھی شائع ہوا۔آزادی کے بعد کے ابتدائی دور کا یہ ایک اہم سفر نامۂ حج ہے۔ اس کا حج کے سفر ناموں کے ارتقا میں اہم کردار رہا ہے۔ ''چند دن حجاز میں'' یہ محمد زبیر کا سفر نامۂ حج ہے۔ محمد زبیر نے ۱۹۵۰ء میں حج کیا تھا ،یہ سفر نامہ اسی سفرِ حج کی روداد ہے۔اس سفر نامہ میں انھوں نے آسان وعام فہم زبان میں اپنے واقعات ومشاہدات کو بیان کیا ہے۔

پاکستان سے تعلق رکھنے والے اردو کے معروف و مشہور فکشن نگار ممتاز مفتی نے ۱۹۶۸ء میں حج کی ادائیگی کے لئے سفر کیا اور اپنے اس سفر کی روداد کو انھوں نے ''لبیک'' کے نام سے سفر نامۂ حج کی شکل میں پیش کیا۔ ممتاز مفتی نے اس سفر نامۂ حج میں اپنے دلی کیفیات اور داخلی جذبات کو افسانوی انداز میں بیان کیا ہے۔آزادی کے بعد کا یہ بڑا اہم سفر نامۂ حج ہے جو اپنے منفرد اسلوبِ نگارش کی وجہ دوسرے حج کے سفر ناموں سے ممتاز ہے۔

حج کے سفر ناموں کے تحقیقی و تنقیدی مطالعہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ حج کے سفر ناموں میں اگرچہ مناظر و موضوعات میں یکسانیت پائی جاتی ہے۔جدہ ، مکہ ، مدینہ ، خانۂ کعبہ ،صفا مروہ ، منیٰ ، میدان عرفہ ، مزدلفہ ، روضۂ نبوی ، مسجد نبوی، بقیع قبرستان وغیرہ ایسے مقامات اور مناظر ہیں جن سے ہر حاجی کو سابقہ پڑتا ہے اور حج کا ہر سفر نامہ نگار اپنے سفر نامہ میں ان چیزوں کو جگہ دیتا ہے لیکن اس کے باوجود حج کے ان سفر ناموں میں جذبات نگاری اور منظر کشی میں تنوع پایا جاتا ہے۔ ہر سفر نامہ نگار کا اظہار تاثر مختلف ہوتا ہے۔ ہر ایک اپنی ذاتی کیفیات اور قلبی تاثرات کو دوسروں سے مختلف پیرائے میں پیش کرتا ہے۔ خاص طور سے آزادی کے بعد جو حج کے سفر نامے لکھے گئے ہیں وہ بہت معیاری اور اعلیٰ درجے کے ہیں کیونکہ آزادی کے بعد حج کے سفر نامہ نگاروں نے بھی دوسرے سفر نامہ نگاروں کی طرح پرانی روایت سے انحراف کیا اور اپنی راہ الگ متعین کی۔

اتنے بڑے پلیٹ فارم سے ہمیں مثبت پیغام پوری دنیا تک پھیلانا چاہیے۔عالمگیریت کے قیام کے لیے باہمی احترام، اعتماد اور امن پر ایمان لازمی ہے۔

ڈاکٹر الیاس عشقی کا وادیٔ مہران سے عشق

افسانہ بدر

ڈاکٹر الیاس عشقی (۱۹۲۲ء۔ ۲۰۰۷ء) کا نام محمد الیاس خان یوسف زئی اور تخلص عشقی ہے۔ وہ ۲ جون ۱۹۲۲ء کو جے پور، راجستھان (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم مقامی تعلیمی اداروں میں حاصل کی۔ بی۔اے اور ایم۔اے اردو آگرہ یونیورسٹی سے کیا اور پی ایچ ڈی کی سند ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کی زیر نگرانی ''اردو شاعری پر مغرب کے اثرات'' کے موضوع پر تحقیقی مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے حاصل کی۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا علمی وادبی سفر قیام پاکستان سے قبل شروع ہوا اور نصف صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے۔ اس دوران آپ نے متعدد زبانوں میں شاعری کے ساتھ ساتھ انگریزی، فارسی، سندھی، پنجابی اور اردو میں مضامین و مقالات لکھے جو ایران، ہندوستان اور پاکستان کے رسائل و جرائد میں شائع ہوئے۔ ادبی دنیا میں آپ ماہر لسانیات، محقق، مترجم اور شاعر کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ فارسی زبان میں آپ کا شعری مجموعہ شعر آشوب (۱۹۷۹ء) اور اردو شاعری کے دو مجموعے دوہا ہزاری (۲۰۰۳ء) اور گنبدِ بے در (۲۰۰۶ء) جب کہ سندھی شعراء کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ ''موج موج مہران (۱۹۷۳ء) شائع ہو چکا ہے۔ نثری تحقیقات و تخلیقات کے حوالے سے آپ کی ایک کتاب " آواز لطیف'' (۲۰۱۴ء) میں اور دوسری اردو شاعری پر مغرب کے اثرات (۲۰۱۹ء) میں شائع ہوئی۔ ان کا جملہ نثری سرمایہ غیر مدون تھا جسے مرتب کر لیا گیا ہے۔ ان میں متنوع موضوعات پر تحقیقی، تنقیدی، شخصی اور مختلف زبانوں کے حوالے سے مضامین و مقالات شامل ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مختلف کتب پر مقدمات، دیباچے فلیپس اور تبصرے بھی لکھے۔ ڈاکٹر الیاس عشقی کا انگریزی، فارسی، سندھی، پنجابی اور

اردو میں قلم بند کیا گیا یہ کثیر الجہتی سرمایہ اب بتدریج شائع کیا جارہا ہے۔ ڈاکٹر الیاس عشقی نے یوں تو مختلف النوع شاہ کار تخلیق کیے مگر آپ نے وادی مہران کے حوالے سے جو قابل قدر کارہائے نمایاں انجام دیے وہ اس مقالے کا حصہ ہیں۔ ان کی علمی وادبی خدمات کے اعتراف میں انھیں متعدد ایوارڈز دیے گئے اور حکومت پاکستان نے بھی ۲۳ مارچ ۲۰۰۱ء کو ستارہ امتیاز سے نوازا۔ ۱۲ جنوری ۲۰۰۷ء کو علم وادب کے آسمان کا یہ دمکتا سورج اپنا سفر مکمل کرکے غروب ہوگیا۔

ڈاکٹر الیاس عشقی کو کئی زبانوں مثلاً ہندی، مارواڑی، اردو، سندھی، پنجابی، فارسی، سرائیکی اور انگریزی پر دسترس حاصل تھی۔ مختلف زبانوں کا ذکر کرتے ہوئے خود الیاس عشقی نے لکھا:

راجستان میں تھا تو راجستھانی جانتا تھا، جو شہر ہندی کا مرکز تھا وہیں سے ہندی شاعری سے دل چسپی ہوئی۔ اکثر مشاعروں میں کلام پڑھا۔ ہندی لکھنا پڑھنا دوستوں کی صحبت میں آگیا۔ ریاست کی ایک زبان برج بھاشا بھی ہے جو شاعری کی زبان بھی ہے، فارسی زبان کا گھر میں چرچا رہتا تھا، لہذا یہ زبان بھی سیکھ گیا۔ انگریزی پڑھی، پاکستان میں آئے تو پنجابی ادب اور شاعری سے دل چسپی ہوئی۔ کچھ لکھنا بھی شروع کیا جو رسائل میں بھی شائع ہوا۔ اب پنجابی ادب کے منتخب مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اس میں ایک مضمون میرا بھی شامل ہے۔ سندھی بولی، پڑھی لکھی۔ شاہ عبداللطیف کے علاوہ تاریخ سندھ، سندھی موسیقی اور سندھی زبان پر لکھے گئے مضامین کئی رسالوں میں شائع ہوئے۔ شاعری بھی معتبر رسالوں میں چھپی۔ سرائیکی زبان کے متعلق مضامین لکھے۔ کبھی کبھی انہیں مضامین پر انگریزی میں لکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالہ زمانہ ''کانپور سے لکھنا شروع کیا۔''

سلطان جمیل نسیم خود کو الیاس عشقی سے محبت کرنے والوں میں شمار کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''عشقی صاحب کا ذہن علمی ہے۔ وہ جہاں جاتے ہیں وہاں کا علم سمیٹ لیتے ہیں۔ اردو، فاری، انگریزی اور ہندی تو گویا ان کے گھر کی زبانیں ہیں۔ پشاور میں رہے تو پشتو اہل زبان کی طرح لکھنے اور بولنے لگے جیسے وہیں کے ہیں اور ہیں وہیں کے خالص یوسف زئی پٹھان۔ جب پشتو جانتے ہیں تو بھلا ہندکو کو کیوں چھوڑا ہوگا۔ پنجابی زبان وادب سے آگاہ اس لیے کہ لاہور میں بھی قیام رہا ہے۔''

آگے چل کر لکھتے ہیں کہ جب انھوں (سلطان جمیل نسیم) نے اپنے ڈراموں کی کتاب ملتان میں اپنے ایک دوست کو بھیجی تو انھوں نے لکھا:

''مجھے یہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ نے کتاب کا انتساب الیاس عشقی صاحب کے نام کیا ہے۔ ہم ملتان والے عشقی صاحب کی بہت عزت کرتے ہیں۔ ایسا عالم فاضل شخص ان کے جانے کے بعد ملتان ریڈیو کو میسر نہیں ہوا۔''

ملازمت کا آغاز ہجرت سے قبل ہی ہوگیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں جب وہ'' مہاراجہ کالج، جے پور میں ایم اے اردو کے آخری سال میں طالب علم تھے، اسی کالج کے لیے لیکچرر کی حیثیت سے منتخب کر لیے گئے تھے۔ سیدہ محسنہ خاتون نقوی نے اپنے مقالے میں لکھا ہے کہ ۹، اکتوبر ۱۹۴۷ء کو الیاس عشقی نے کالج میں لیکچرر کا منصب سنبھال لیا ہے لیکن ڈاکٹر ابراہیم خلیل کا خط پانے کے بعد آپ ملازمت چھوڑ کر اپنے والد کے پاس پاکستان (کوٹری سندھ) آگئے۔ کوٹری سے ایک ادبی رسالہ احسان عظیم صدیقی (مرحوم) کی زیر ادارت نکلتا تھا۔ الیاس عشقی کی تدفین کے وقت ان سے ملاقات ہوئی تو انھوں نے بتایا کہ ہجرت کر کے جب الیاس عشقی پاکستان آئے اور کوٹری کو انھوں نے اپنا مسکن بنایا تو اسی زمانے میں انھوں نے کوٹری کے اسکول میں کچھ عرصے تک تدریس کے فرائض بھی انجام دیے جس کے وہ چشم دید گواہ ہیں۔ تاہم اسکول سے اس طرح کی دستاویزی شہادت نہ مل سکی۔ پاکستان آمد سے

قبل آپ پروفیسر اردو کے لیے انٹرویو بھی دے چکے تھے اور یہاں کام یابی کی اطلاع بھی ملی مگر پھر آپ واپس ہندوستان نہیں گئے۔ پاکستان ہجرت کے حوالے سے الیاس عشقی لکھتے ہیں کہ :

''۱۹۴۸ء میں پاکستان آنا پڑا۔ دو سال بیکاری میں گذرے۔ ایک سال سے زیادہ والدہ کی علالت چلی پھر ان کا انتقال ہو گیا۔''

دورانِ ملازمت ادبی سفر :

ڈاکٹر الیاس عشقی کو علم وادب سے ذوق وشوق گھر کے ماحول کی وجہ سے بچپن ہی سے تھا۔ آپ کے دادا فضل نبی خان شفا کا شمار اساتذہ فن میں ہوتا ہے۔ خود والد گرامی علامہ رز کی جے پوری ادبی حلقوں کی ایک ممتاز و معروف شخصیت تھے۔ والدہ بھی زبان دانی اور شعر و سخن کی فہم وفراست میں کسی سے پیچھے نہ تھیں۔ وہ اکثر ذکر کرتے تھے کہ وہ کوئی ادیب وغیرہ نہیں ہیں۔ البتہ جو مضامین (جنھیں بعض اوقات وہ مضامین ہی سے خارج کرتے تھے) لکھے ہیں یہ دوست احباب کی خواہش یا طلب پر لکھے ہیں۔ جب بھی کسی دوست احباب نے کسی موضوع پر کچھ لکھنے کی فرمائش کی یا زور دیا تو انھیں کچھ نہ کچھ لکھ کر دے دیا۔ باقاعدہ لکھنے کا ایسا شوق کبھی نہیں رہا۔ وہ بجز اور انکساری کے سبب خود کو ادیب / نثر نگار نہیں سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنی تحریروں کی کاپی کبھی اپنے پاس محفوظ نہیں کی۔ جو سرمایہ شائع ہو گیا وہ منظر عام پر آ گیا اور جو کسی نے لکھوایا مگر شائع نہیں کیا وہ ضائع ہی ہو گیا۔

ملازمت کے دوران آپ نے فرائض منصبی ادا کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی ادبی صلاحیتوں کو نکھارا۔ تقریباً ہر جگہ آپ کو اردو کے معروف اہلِ قلم اور ادیب ملتے رہے اور آپ کے ادبی حلقے میں بھی اضافہ ہوتا رہا۔ سندھ میں بھی ان کی ملاقات مشاہیر علم وادب سے رہی۔ ان میں مخدوم محمد زمان طالب المولیٰ علی احمد تالپور، رسول بخش تالپور، حافظ مبارک علی شاہ، نامدار وکیل، این اے بلوچ، تنویر عباسی، مولانا غلام محمد گرامی، اکبر علی شاہ، غلام مصطفی خاں، شیخ ایاز، غلام مصطفی قاسمی، غلام علی الانا وغیرہ شامل ہیں ان کے علاوہ پیر حسام الدین راشدی سے بھی نیاز مندی کا شرف حاصل رہا۔ آپ نے استاد اختر انصاری اکبر آبادی کے رسالے نئی قدریں کی مشاورت کی۔ خانہ فرہنگ ایران سے تعلق رہا اور انھوں نے دوستداران فارسی کے نام سے ایک انجمن بنائی اور الیاس عشقی کو اس کا صدر بنایا اور ساتھ ہی اپنے مجلہ کا مدیر بھی مقرر کیا۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے ''جہاں بھی گئے داستاں چھوڑ آئے'' کے مصداق وادی مہران سے بھی اپنے تعلق کو بخوبی نبھایا۔ سندھ میں رہتے ہوئے انھوں نے سندھی زبان اور اہلِ سندھ سے اپنی بھرپور محبت کا اظہار فرمایا۔ آپ نے نہ صرف یہ کہ سندھی زبان میں شاعری کی بلکہ سندھی زبان کے معروف قدیم وجدید شعرا کے کلام کا منظوم اردو ترجمہ بھی کیا جسے ۱۹۷۳ء میں انجمن ترقی اردو نے موج موج مہران کے نام سے شائع کیا جب کہ آپ کی سندھی شاعری سندھی زبان کے مختلف جرائد ورسائل میں بکھری ہوئی ہے۔ اسی طرح سندھی زبان میں لکھے گئے مضامین و مقالات بھی سندھی زبان کے مقبول جرائد ورسائل میں اپنی بہار دکھا رہے ہیں کے جو سندھی زبان وادب سے آپ کی محبت اور لگاؤ کی منہ بولتی تصویر ہے۔

ڈاکٹر الیاس عشقی نے وادی مہران سے اپنی محبت اور دلی لگاؤ کا اظہار کرتے ہوئے اہل سندھ، سرزمین سندھ اور سندھی زبان کے ادبی سرمائے کو اردو دان طبقے کے لیے اردو زبان میں بھی قلم بند فرمایا۔ اس حوالے سے دستیاب مضامین و مقالات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

- نسوانیت کی آواز
- سندھی روایتی شاعری (دسمبر 1922ء)
- شاہ عبداللطیف کی شاعری (مئی، جون 1973ء)

- شاہ کا رسالہ اور سندھی موسیقی، (مئی، جون 1973ء)
- جامع کمالات امیر خسرو: سندھی زبان اور سندھی موسیقی، (جنوری، فروری 1972ء)
- شاہ عبداللطیف بھٹائی اور سندھی موسیقی، (مئی 1978ء)
- رسالہ (سندھی روایت میں اردو کلام)، (اگست ستمبر ۱۹۸۳ء)
- سندھی شاعری کے تراجم (دسمبر 1984ء)
- اردو رسالے کا ایک باب، سریمن کلیان (ستمبر 1987ء)
- سرکاپایتی (نومبر 1988ء)
- سندھی زبان اور اس کے الفاظ
- چھوکرا۔ چھوکری (فروری 1993ء)
- شاہ عبداللطیف بھٹائی کی حقیقی عظمت (ستمبر 1992ء)
- موئن جودڑو (حقیقت اور افسانہ)، (دسمبر 2002ء)

ڈاکٹر الیاس عشقی نے شاہ عبداللطیف بھٹائی اور ان کے کلام کے حوالے سے مختلف پہلوؤں سے مضامین تحریر کیے۔ وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ انھوں نے شاہ کے کلام کے حوالے سے ایسے مضامین لکھے ہیں کہ سندھی زبان میں بھی ان کی مثال نہیں ملتی۔ وہ مضامین آصف فرخی صاحب کے پاس تھے جو بوجوہ اس درجے تاخیر کا شکار ہوئے کہ ان کی زندگی میں شائع نہ ہو سکے۔ الیاس عشقی کے انتقال کے بعد ان کی بیٹی پروفیسر روزی صاحبہ نے وہ مضامین ان سے حاصل کر کے زیور طبع سے آراستہ کیے اور ۲۰۱۴ء میں ''آواز لطیف'' کے نام سے ان کی اشاعت عمل میں آئی۔ آواز لطیف'' کے پیش لفظ A میں شاہ عبداللطیف بھٹائی سے متعلق لکھے گئے مضامین کے بارے میں وہ لکھتے ہیں:

میں نے شاہ لطیف کی شاعری اور فن کے بارے میں جتنے مضامین لکھے ہیں وہ سب کسی نہ کسی سوال کے مفصل جواب میں قلم بند ہوئے ہیں۔ ایسا ہی ایک سوال یہ ہے کہ شاہ صاحب کیسے شاعر ہیں؟ جس کے مفصل جواب کا نہ یہاں موقع ہے اور نہ وقت لیکن اس سوال کا جواب اس کتاب میں مختلف مقامات پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ایک سوال یہ ہے کہ کیا کوئی ایسا کلام رسالے میں ہے جو صرف شاہ لطیف ہی کہہ سکتے تھے اور کسی اور شاعر کے کلام میں اس قسم کے اشعار موجود نہیں ہیں۔ اس کا ایک سیدھا سا جواب تو یہ ہے کہ بڑے شعرا کا بہترین کلام ایسا ہی ہوتا ہے جو ان کے علاوہ کوئی اور نہیں کہہ سکتا تھا۔ لیکن سوال کی نوعیت اور دریافت کرنے والوں کے مقصد کو نظر میں رکھ کر یہ بات بڑے وثوق اور پوری ذمے داری سے کہی جا سکتی ہے کہ شاہ لطیف ایک عوامی شاعر تھے۔ ان کو سندھ کی ثقافت اور دیہاتی زندگی سے دلی لگاؤ تھا۔ ان کا ایک قدم کلاسیکی شاعری کی زمین پر تھا۔ اس لیے جہاں ان کے کلام میں شاعری دیہاتی رنگ میں ظاہر ہوئی ہے۔ اس کی مثال ان کے علاوہ کہیں اور ملنی شاید ممکن نہیں ہے۔'' (ص۔۱۵)

کتاب کے مشمولات میں پیش لفظ کے علاوہ مشرق کی آواز، تصوف کی آواز، شاعر کی آواز، دیہات اور دیہاتی فیلسوف کی آواز، نسوانیت کی آواز علم کی آواز، فن کی آواز، نغمے کی آواز، منفرد آواز ہضمیر کی آواز اور حرف آخر کے علاوہ ضمیمے میں شاہ کے مختصر حالات زندگی، شاہ صاحب کی شادی خانہ آبادی (عشق کی حقیقت)، اعتراف لطیف (نظم)، الیاس عشقی (اخلاقی اور روحانی سبق) شاہ کا مذہب (مضمرات)، شاہ اور مستشرقین، شاہ کے رسالے کے خطی اور طبع شدہ مطبوعہ (لیتھو اور ٹائپ کے) نسخے، شاہ لطیف پر.....(انکپلیٹ)

مصورانہ خطاطی کے تخلیق کار
عظیم آرٹسٹ ''صادقین'' مرحوم

پروفیسر لطافت علی جوہر

مصوری وخطاطی فن وآرٹ کی اہم شاخین ہیں، فن انسانی زندگی کے لیئے روشن، تابناک و صحتمند معیار و انداز پیدا کرتا ہے، دماغ کی پاکیزگی ذہن کی تعمیر، فکرِ کی تشکیل اور نفسیات کا تعلق ادب شعر اور مصوری سے ہے موسیقی ادب کا نغمہ زیر پہلو ہے جو جذبات میں حدت و حرارت پیدا کرتا ہے لیکن اگر ادب و فن، مصوری و موسیقی بے روح اور بے مقصد ہیں تو پھر ہمارے معاشرے میں جو ثقافتی، تہذیبی اور تمدنی رجحانات پیدا ہونگے وہ پورے معاشرے اور انسان کے اجتماعی نظام کو کھوکھلا بنادیں گے۔

ادب زندگی کا ترجمان ہے، شعر زندگی کی تنقید، موسیقی روح کی غذا اور مصوری ''ذوق جمالیات'' کو جلا بخشنے والا حسن و جمال اور ''روح حیات'' ہے۔ جبکہ خطاطی اپنی کمال خوبی سے الفاظ کو خوبصورتی و نفاست بخشتی ہے مصوری کی روایت اور تاریخ بہت قدیم ہے۔ ڈاکٹر اے۔ایچ۔دانی اور جرمن ماہر آثار قدیمہ پروفیسر کارل یتمار کی تحقیقات کے مطابق گلگت کے علاقے چیلاس اور شاہراہ ریشم سے ملحق علاقوں سے دریافت شدہ پتھروں پر کندہ تصویروں اور خاکوں کا تعلق تین ہزار سال تا پانچ ہزار سال قبل مسیح ہے۔ پاکستان کی سرزمین زمانہ قدیم میں دنیا کی بعض قدیم تہذیبوں کا گہوارہ رہی ہے، موہن جو دڑو، بھنبھور، کوٹ ڈیجی، آمری جو دروپڑپہ، ٹیکسلا وغیرہ سے جو آثار دریافت ہوئے ہیں ان میں ظروف اور مجسمہ سازی کو اولیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ پاکستان کی سرزمین زمانہ قدیم میں مصوری وفنون کا مرکز رہی ہے۔

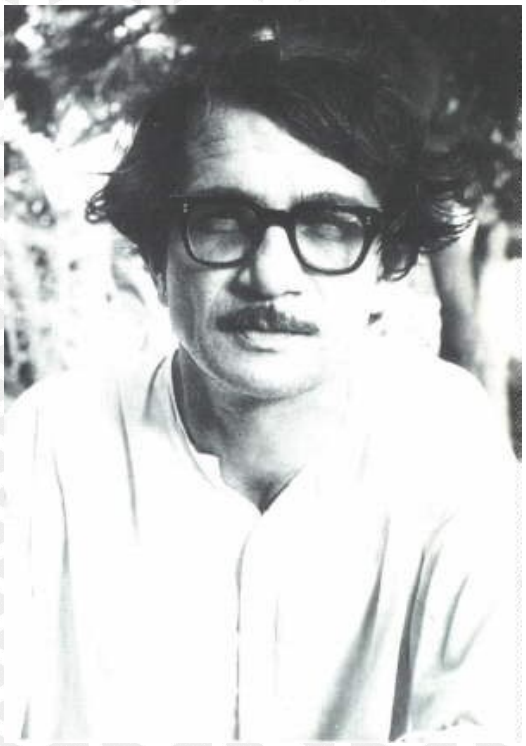

مغل عہد میں فن تعمیر کے ساتھ مصوری کے فن نے بے انتہا ترقی کی۔ مغل بادشاہ بابر کے عہد حکومت میں ''مغل مصوری'' کی ابتدا ہوئی اور اس کی بنیاد لاہور میں رکھی گئی جس کی بدولت لاہور مصوری اور مصوروں کا سب سے بڑا مرکز بن گیا تھا۔ مغلوں کے زوال کے بعد

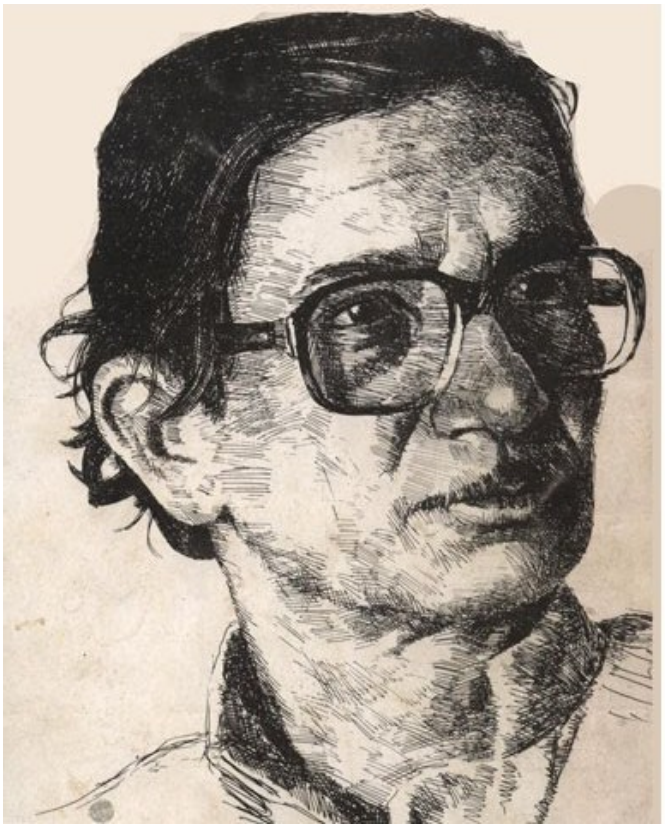

جب برصغیر پر انگریزوں کی حکومت آئی تو اس وقت برصغیر میں لاہور واحد شہر تھا جو مصوری کا مرکز تھا اور اسے یہ مرکزیت مغل بادشاہت کے دوٗر سے حاصل تھی۔ انگریزوں کی آمد اور حکومت کے بعد یہاں کے مصوروں کا فنی اُفق کافی وسیع ہوا انگریزوں نے نہ صرف فن مصوری کی پذیرائی کی بلکہ اس کی سرپرستی و فروغ کے لیئے 1857ء میں لاہور میں ’’میو اسکول آف آرٹ‘‘ قائم کیا جس کے قیام سے فن مصوری میں ایک انقلابی موڑ آیا جس نے روایتی طرز مصوری کا دھارا موڑ دیا۔ ’’میو اسکول آف آرٹ‘‘ نے اس خطے میں جدید مصوری اور فنی جدت سے آشنا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔

قیام پاکستان کے بعد ’’میو اسکول آف آرٹ‘‘ کو ترقی دے کر ’’نیشنل کالج آف آرٹ‘‘ کی حیثیت دے دی گئی اس کالج سے نامور مصوروں نے تحصیل فن کی ہے لاہور کے بعد مصوری اور مصوروں کا

دوسرا بڑا مرکز کراچی شہر بننے لگا۔ کراچی میں 1947ء میں احمد سعید ناگی نے اپنا اسٹوڈیو قائم کیا۔

1960ء کی دہائی کو پاکستانی مصوروں اور مصوری کا ایک بھرپور دوٗر کہا جاتا ہے اس دوٗر میں شاکر علی، علی امام، انور جلال، شمزا، احمد پرویز، آزر زوبی، حنیف رامے، صادقین، معین نجمی، قطب شیخ، ایس صفدر، گل جی، اقبال جعفری، خالد اقبال، رضیہ فیروز، نسیم حفیظ قاضی، مریم شاہ حبیب، انور افضل، ناظر شمسی، اے۔ کے سجاد، بشیر مرزا، جمیل نقش وغیرہ کے نام نمایاں تھے۔

اس عہد کے نامور مصوروں میں سے جس مصور نے مصورانہ خطاطی کے منفرد فن میں جو کمالیت حاصل کی ان میں ایک نام ’’صادقین‘‘ کا ہے صادقین نے اللہ کی آخری کتاب قرآن مجید کی آیات خطاطی میں وہ کمال فن دکھایا کہ آج جدید اور سائنٹیفک دوٗر میں

بھی حیرانی سے دیکھا جاتا ہے انہوں نے فنون لطیفہ کے اس شعبے میں ا یسے ایسے شاہکار تخلیق کیئے ہیں کہ ان کی مثالیں ملنا مشکل ہے۔

سید صادقین احمد نقوی 25 جون 1930ء کو امروہہ (بھارت) میں پیدا ہوئے 1948ء میں آگرہ یونیورسٹی سے بی۔اے کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد پاکستان آگئے دو سال 1951 تا 1952ء ریڈیو پاکستان کراچی میں پروگرام اسٹنٹ رہے مصوری کا ذوق وصلاحیت قدرت نے بدرجہ وافر عطا کی تھی۔

صادقین نے کسی آرٹ اکیڈمی یا اسکول سے تربیت حاصل نہ کی اور نہ ہی کسی کی شاگردی اختیار کی اور نہ ہی ان کا کوئی شاگرد ہوا۔ اپنے ذوق وشوق سے مصوری خطاطی کی خداداد صلاحیت کو انہوں نے سخت محنت اور جاں فشانی سے پروان چڑھایا اور بہت جلد اپنی منفرد خطاطی و مصوری کے جھنڈے گاڑ دیئے ان کے فنی اسلوب کو بڑے پیمانے پر سراہا گیا۔ وہ مصوری کی راہ سے ہوتے ہوئے خطاطی کی منزل تک جا پہنچے اور اپنے منفرد خط کی بنا پر انہوں نے اردو خطاطی کی عظیم معراج حاصل کی۔ وہ ایک خود ساختہ، خود کی تعلیم دینے والے مصور تھے جنہیں انتہائی کم عمری میں آرٹ کے میدان میں ''عالمی شہرت'' حاصل ہوئی یہ شہرت میورلز (دیواری تصاویر) سے ہائی اپنا پہلا میورل انہوں نے کراچی ایئرپورٹ پر بنایا پھر مزید میورل سے کسٹمز کلب، سروسز کلب، سینٹرل ایکسائیز لینڈ کی دیواریں مزین کیں۔

1961ء میں اسٹیٹ بینک آف پاکستان کراچی کی لائبریری میں ایک عظیم الشان میورل بنایا جسے ''وقت کے خزانے'' کا نام دیا۔ اس میورل میں سقراط سے البرٹ آئن اسٹائن تک ہر عہد کے علمی اور سائنسی ارتقاء کو بڑی مہارت وخوبصورتی سے عکس بند کر کے محفوظ کیا۔

1961ء کے وسط میں ان کے کام کی شہرت '' Biennale of

Paris'' جا پہنچی، فرانس کی حکومت نے پانچ ماہ کے لیئے انہیں پیرس بلا یا یوں وہ پیرس چلے گئے انہوں نے ساتھ برس تک پیرس اور یورپ میں اپنے فن کا لوہا منواتے ہوئے لاتعداد یادگار نمونے اور فن کے شاہکار پیش کیئے دنیا کی بڑی بڑی آرٹ گیلریوں میں، عالمی نمائشوں میں لاتعداد ایوارڈ، انعامات اور اعزازت حاصل کیئے۔

صادقین کے شاہکار ''The Last Supper'' نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔

فرانس کے بعد صادقین نے کچھ عرصہ آمریکا میں گذارا وہ زندگی میں مسلسل کامیابیاں حاصل کرتے رہے جوں جوں ان کے سر پر عظمتوں کے تاج سجتے گئے وہ شہرت کی بلندیوں کی مزید چھوتے گئے۔۔

1969ء میں غالب کی صد سالہ برسی کے موقع پر انہوں نے کلام غالب کو بڑی خوبصورتی سے مصور کیا اور تقریباً 50 بڑی تصاویر تخلیق کیں۔ 1970ء میں قرآن شریف کی سورۃ الرحمٰن کی آیات کو انتہائی دلکش انداز میں پینٹ کیا اور مصورانہ خطاطی کے ایک نئے اسلوب و دبستان کی بنیاد ڈالی۔ 1972ء سورۃ یٰسین کو ایک 260 فٹ طویل پینل پر تحریر کیا اور یہ پینل لاہور کے عجائب گھر کو گفٹ کر دیا۔

1973ء کو لاہور کے عجائب گھر کی چھت کو اپنی لازوال مصوری سے سجایا۔ اس کے بعد دارالقرآن (پنجاب پبلک لائبریری) کو آیات قرآنی کی پاکیزہ و دلنشین خطاطی سے سجایا جو آج بھی ان کی قومی خدمات کے طور پر یادگار ہیں صادقین ایک بین الاقوامی نمائشی میلے میں شرکت کے لیئے 1981ء میں صرف ایک ہفتے کے لیئے بھارت گئے مگر بھارتی حکومت اور محکمہ ثقافت کے بیحد اصرار پر انہوں نے چودہ ماہ وہیں بسر کیئے اس قیام کے دوران صادقین نے علی گڑھ یونیورسٹی، بنارس یونیورسٹی، سرِنگا پٹم میں ٹیپو سلطان کے مزار دہلی میں اسلامک ریسرچ انسٹیٹیوٹ کی دیواروں اور چھتوں پر اپنے فن کے نقش ثبت کیئے، بھارت میں قیام کے دوران اُن سے آٹو گراف لینے والوں کا ہجوم رہتا تھا۔ وہ ایک بند کمرے میں بیٹھ جاتے اور لوگ قطار باندھ کر کھڑکی میں سے اُن سے فرمائش کر کے اپنی پسندیدہ آیات لکھواتے تھے۔

1986ء میں صادقین نے کراچی کے ''جناح ہال''/فریئر ہال کو اپنی تصاویر سے آراستہ کرنا شروع کیا جس کا بنیادی موضوع ''الارض والسماء'' تھا۔ وہ اپنے کام میں مگن تھے کہ اچانک حملہ قلب (Heart Attack) ہوا تاہم موت کے بے رحم ہاتھوں نے یہ کام مکمل کرنے نہ دیا وہ ادھورا کام چھوڑ کر راہی ملک عدم ہوئے اور 10 فروری 1987ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

صادقین کا آخری شاہکار 4x8 فٹ کے 100 پینلز پر نقش ہونا تھا وہ ان میں سے 87 پینل مکمل کر پائے تھے۔

وہ ایک عظم فنکار اور فن کے نگران و سرپرست تھے اور ایک خود ساختہ، خود کی تعلیم دینے والے مصور تھے، مکمل طور پر غیر روایتی آرٹ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ کسی دوسرے صاحب فن و کمال سے متاثر ہونے کے آثار ظاہر نہیں کرتے تھے جو ان سے پہلے یا اُن کے دوَر میں مروج تھے۔

صادقین کے فنِ کمالیت نے پاکستانی فن مصوری کو خطاطی سے آمیز کر کے جو گہرے نقش مرتب کیے ہیں وہ نصف صدی سے زیادہ عرصہ گذرنے کے باوجود آج بھی درخشاں باب کی طرح روشن ہیں۔ حکومت پاکستان نے ان کی خدمات کو سراہتے ہوئے کئی انعامات و اعزازات سے سرفراز کیا۔

صادقین کے فن کو تسلیم کرتے ہوئے ''تمغہ امتیاز''، ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' صدر پاکستان کی جانب سے ''تمغہ اعزاز'' اور ''ستارہ امتیاز'' سے نوازا گیا وہ کراچی کے سخی حسن قبرستان میں آسودہ خاک ہیں۔■

فیض احمد فیض

رومانی اور انقلابی شاعر بیک وقت

محمد سمیع

فیض صاحب کی اس بے پناہ مقبولیت کا اصل سبب یوں تو ان کا کلام ہی ہے جس نے ایک عالم کو ان کا گرویدہ بنا لیا لیکن ان کی ہر دل عزیزی میں ان کی شخصیت کی مقناطیسیت بھی شامل ہے اور وہ خدمات بھی جو فیض صاحب نے ہماری تہذیب کی اصلاح اور ترقی کی خاطر سرانجام دیں۔ ان کے مزاج کی نرمی اور مٹھاس، ان کا دھیما لہجہ، ان کی مسکراہٹ، ان کی شائستگی، دوسروں کی دل آزاری اور عیب جوئی سے پرہیز، انکا پُروقار ضبط و تحمل، ان کی کسر نفسی اور ملنساری، ظلم و جبر کی سختیوں کو ہنس ہنس کر برداشت کرنے کی قوت اور اپنے اصولوں کی خاطر بڑی سے بڑی قربانی کا جذبہ، ان کے وہ اوصاف تھے جن کی وجہ سے ہر طبقے، ہر فرقے کے لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔

دوسرے ملکوں کی مانند پاکستان میں بھی امن کمیٹی بنی تو فیض صاحب ہی اس کے صدر چنے گئے۔ وہ امن کمیٹی کی سرگرمیوں میں بڑی پابندی سے شریک ہوتے اور لاہور، اوکاڑہ، گوجرانوالہ، لائل پور، غرضیکہ جہاں کہیں امن کمیٹی کا جلسہ ہوتا اس میں تقریر کرتے اور لوگوں کو بتاتے کہ پاکستان کی آزادی، بقا اور ترقی کے لیے امن کتنا ضروری ہے کیونکہ ان کے بقول ''امن گندم کے کھیت ہیں اور سفیدے کے درخت، دلہن کا آنچل ہے اور بچوں کے ہنستے ہوئے ہاتھ، شاعر کا

قلم ہے اور مصور کا موقلم''۔ ان کا کہنا تھا کہ پرانے زمانے کی جنگوں اور آج کل کی جنگوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ پرانے زمانے میں جب لوگ تلوار بندوق سے لڑتے تھے تو تباہی ضرور آتی تھی لیکن اس کا دائرہ بہت محدود ہوتا تھا اور آبادی کا بہت ہی مختصر حصہ اس سے متاثر ہوتا تھا جس فریق نے میدان جنگ میں شکست کھائی وہ تاج و تخت سے محروم ہوا، ملک کی عنانِ اقتدار فاتح کے قبضے میں آگئی اور زندگی بدستور پرانے ڈگر پر چلنے لگی لیکن آج امن کے معنی ہیں بنی نوع انسان کی بقا اور ایٹمی جنگ کے معنی ہیں کہ دنیا ملبے کا ڈھیر ہو جائے اور انسان، جانور، برگ و شجر کسی کا سرے سے وجود ہی باقی نہ رہے فیض صاحب کے بقول امن کی جدوجہد اور آزادی کی جدوجہد ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں جو امن کا دوست ہوگا وہ لامحالہ آزادی کو بھی عزیز رکھے گا اور جو امن کا دشمن ہوگا وہ آزادی کا بھی دشمن ہوگا۔

فیض صاحب کی شخصیت بڑی پہلودار تھی۔ انہوں نے شعر و شاعری کے علاوہ اور بہت سے کام بھی کیے اور جس کام میں ہاتھ ڈالا اس کو ایسے سلیقے سے سرانجام دیا کہ ان کی جگہ پھر کبھی پُر نہ ہوئی۔ انہوں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کالج میں انگریزی پڑھانے سے کیا۔ پہلے امرتسر میں، پھر لاہور میں اور آخر میں ہارون کالج کراچی میں۔ وہ نہایت مشفق استاد تھے اور اپنی لیاقت اور حسنِ اخلاق کے باعث اساتذہ اور طلبا میں یکساں مقبول تھے جس وقت فیض صاحب ہارون کالج کراچی کے پرنسپل ہوئے تو کالج پر نزع کا عالم طاری تھا۔ عمارت خستہ حال اور بے سروسامان اور کھڈّا کے نہایت پس ماندہ علاقے کے نادار اور بے یارو مددگار بلوچ طلبا، نہ ان میں تحصیلِ علم کا شوق نہ اساتذہ میں تدریس کی لگن، مگر فیض صاحب نے تھوڑے ہی عرصے میں اپنی محنت اور محبت سے کالج کا نقشہ ہی بدل دیا اور ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کالج ایک زندہ اور فعال ادارہ بن گیا۔

فیض صاحب نے جب اخبار نویسی شروع کی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ان کے جوہر اور کھُلے۔ ان کے اداریے صلابت رائے کے علاوہ ادبی فن پارے بھی ہوتے تھے جن کو ہر شخص مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ انہوں نے اپنے حسنِ سلوک سے صحافیوں کی ایک ایسی ٹیم اپنے گرد جمع کر لی تھی جو اخبار کی صوری اور معنوی خوبیوں کی دھن میں دن رات لگی رہتی تھی۔ فیض صاحب نے اپنے زمانے میں صحافتی اخلاق کا جو معیار قائم کیا تھا اور جس جرأت سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اس کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔

فیض صاحب نے جب اخبار نویسی شروع کی اور پاکستان ٹائمز کے ایڈیٹر مقرر ہوئے تو ان کے جوہر اور کھُلے۔ ان کے اداریے صلابت رائے کے علاوہ ادبی فن پارے بھی ہوتے تھے جن کو ہر شخص مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ انہوں نے اپنے حسنِ سلوک سے صحافیوں کی ایک ایسی ٹیم اپنے گرد جمع کر لی تھی جو اخبار کی صوری اور معنوی خوبیوں کی دھن میں دن رات لگی رہتی تھی۔ فیض صاحب نے اپنے زمانے میں صحافتی اخلاق کا جو معیار قائم کیا تھا اور جس جرأت سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اس کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔

فیض صاحب حسن و محبت کے شاعر ہیں۔ ان کا آدرش دنیا میں حسن و محبت کی فرمانروائی ہے۔ زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ، غمِ ذات اور غمِ زمانہ سے ان کا گہرا لگاؤ، ان کی انسان دوستی اور حب الوطنی، ان کی انقلاب پسندی اور آرزو مندی سب درد عشق ہی کے استعارے ہیں، دردِ عشق جو ان کے طرزِ فکر و احساس کی روح ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے دل کی خانہ ویرانی کو حسن دوعالم کے جلوؤں سے منور کرتے ہیں۔

تھے جن کو ہر شخص مزے لے لے کر پڑھتا تھا۔ انہوں نے اپنے حسنِ سلوک سے صحافیوں کی ایک ایسی ٹیم اپنے گرد جمع کر لی تھی جو اخبار کی صوری اور معنوی خوبیوں کی دھن میں دن رات لگی رہتی تھی۔ فیض صاحب نے اپنے زمانے میں صحافتی اخلاق کا جو معیار قائم کیا تھا اور جس جرأت سے وہ اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے اس کو لوگ آج بھی یاد کرتے ہیں۔ وہ فلمی صنعت سے وابستہ ہوئے تو ان کی نگرانی میں ایسی لاجواب فلمیں بنیں کہ ہر جگہ ان کی دھوم مچ گئی۔ انہوں نے الحمرا کا نظم و نسق سنبھالا تو جس ویرانے میں الو بولتے تھے، اس کے در و دیوار نغمہ ساز کی آوازوں سے گونجنے لگے اور الحمرا لاہور کا سب سے سرگرم تہذیبی مرکز بن گیا۔ اب جس ادیب کو دیکھو الحمرا کی طرف کھنچا چلا جا رہا ہے۔ کسی کمرے میں ڈرامے کی ریہرسل ہو ایک ایسے کسی گوشے سے گانے کی آوازیں آ رہی ہیں اور کسی ہال میں تصویروں کی نمائش لگی ہوئی ہے۔

فیض صاحب نہایت حسّاس شاعر تھے۔ انہوں نے ہمیں سکھایا کہ اپنا غم جو ہے تو یہ بہت معمولی سی چیز ہے۔ دنیا بھر کے دکھ دیکھو اور اپنے لوگوں اور اپنی قوم اور اپنے ملک کے۔ ان کی بپتا کے بارے میں سوچنا چاہیے کہ اپنے لیے ہی سوچتے رہو گے۔ یہ تو خود غرضی ٹھہری۔ یہ شعر اسی زمانے کی یادگار ہے۔

اور بھی غم ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

فیض صاحب حسن و محبت کے شاعر ہیں۔ ان کا آدرش دنیا میں حسن و محبت کی فرمانروائی ہے۔ زندگی کے حسن سے لطف اندوز ہونے کا جذبہ، غمِ ذات اور غمِ زمانہ سے ان کا گہرا لگاؤ، ان کی انسان دوستی اور حب الوطنی، ان کی انقلاب پسندی اور آرزو مندی سب درد عشق ہی کے استعارے ہیں، دردِ عشق جو ان کے طرزِ فکر و احساس کی روح ہے اور جس کی بدولت وہ اپنے دل کی خانہ ویرانی کو حسن دو عالم کے جلوؤں سے منور کرتے ہیں۔

فیض صاحب کی نظر میں حسن کی کسوٹی اس کی اخلاقیت ہے۔ فرماتے ہیں کہ ”ہر وہ چیز جس سے ہماری زندگی میں حسن یا لطافت یا رنگینی پیدا ہو جس کا حسن ہماری انسانیت میں اضافہ کرے، جس سے تزکیہ نفس ہو، جو ہماری روح کو مترنم کرے، جس کی لو سے ہمارے دماغ کو روشنی اور جِلا حاصل ہو صرف حسین ہی نہیں مفید بھی ہے“۔

نظریہ رواقیت
ہر برائی اچھائی کا نیا ذریعہ بن سکتی ہے

اطہر بیگ

ہم میں سے زیادہ تر کالج میں کم از کم ایک ایسے دانشور کو یاد کر سکتے ہیں جس نے لاتعداد گھنٹوں کا مطالعہ مارکس کے انتہائی غیر واضح فلسفیانہ نکات یا حقوق نسواں کے لیے وقف کیا تھا۔

خوش قسمتی سے، چند فلسفیانہ نظام موجود ہیں جو بغیر کسی لگی لپٹی کے ڈرامائی حقیقی دنیا کے اثرات پیدا کرنے کے لیے بنائے گئے ہیں۔ بد قسمتی سے، انہیں سزا ملتی ہے کیونکہ ان کے پاس ہفتوں کے لیکچرز اور مہنگی نصابی کتب کے لیے درکار ابہام کی کمی ہے۔

کاروباری اور پیداواری گروتھ فیرس نے وضاحت کی کہ کس طرح قدیم یونان اور روم کے سٹوک فلسفیوں کی طرف سے سکھایا جانے والا ''عملی مایوسی'' ایک مصنف اور مقرر کے طور پر ان کی کامیابی کے لیے لازمی تھا۔

فیرس نے ''منفی تصور'' کی سٹوئیک تکنیک کی وضاحت کی ہے جیسا کہ مصنف ولیم بی اروائن William B. Irvine نے اپنی کتاب ''اچھی زندگی کی رہنمائی: دی قدیم آرٹ آف سٹوک جوی''، A Guide to the Good Life: The Ancient Art of Stoic Joy۔ میں اسے کہا ہے۔

ایک گائیڈ ٹو دی گڈ لائف میں، اروائن نے Stoicism کی ایک تازگی آمیز پیشکش پیش کی ہے، جس میں دکھایا گیا ہے کہ یہ قدیم فلسفہ اب بھی ہمیں ایک بہتر زندگی کی طرف کیسے لے جا سکتا ہے۔ نفسیاتی بصیرت اور Stoics کی عملی تکنیکوں کا استعمال کرتے ہوئے، Irvine ہر اس شخص کے لیے ایک روڈ میپ پیش کرتا ہے جو دائمی عدم اطمینان کے احساسات سے بچنے کی کوشش کرتا ہے جو ہم میں سے بہت سے لوگوں کو متاثر کرتا ہے۔ اروائن سکون حاصل کرنے کے لیے مختلف Stoic تکنیکوں کو دیکھتا ہے اور دکھاتا ہے کہ ان تکنیکوں کو ہماری اپنی زندگی میں کیسے کام کرنا ہے۔ جیسا کہ وہ ایسا کرتا ہے، وہ Stoicism پر عمل کرنے کے اپنے تجربات کو بیان کرتا ہے اور ان قدیم فلسفیوں کے نقش قدم پر چل کر بہتر زندگی گزارنے کے خواہشمند ہر فرد کے لیے قیمتی مشورے پیش کرتا ہے۔ قارئین سیکھتے ہیں کہ کس طرح پریشانی کو کم کیا جائے، ماضی کو کیسے چھوڑا جائے اور اپنی کوششوں کو ان چیزوں پر مرکوز کریں جن پر ہم قابو پا سکتے ہیں، ہم میں سے بہت سے بڑے خوفوں میں سے ایک یہ ہے کہ ہماری تمام تر کوششوں اور کوششوں کے باوجود، ہم آخر میں دریافت کریں گے کہ ہم نے اپنی زندگی برباد کر دی ہے۔ A Guide to the Good Life میں، William B. Irvine نے Stoic فلسفے کی حکمت پر روشنی ڈالی، جو کہ قدیم روم میں

سب سے زیادہ مقبول اور کامیاب مکتبہ فکر میں سے ایک ہے، اور یہ ظاہر کرتا ہے کہ اس کی بصیرت اور مشورے اب بھی جدید زندگیوں پر کس طرح قابل ذکر ہیں۔

اس پر عمل کرنے کے لیے، کسی بھی صورت حال میں بدترین صورت حال پر پوری تفصیل سے غور کریں۔ مثال کے طور پر، سینیکا نے اپنے طالب علموں کو سکھایا کہ وہ خود کو یاد دلائیں کہ ان کے پیارے ایک دن مر جائیں گے۔ خیالات تاریک ہو سکتے ہیں، لیکن وہ آپ کو اس بات کی اجازت دے سکتے ہیں کہ آپ جو کچھ آپ کے پاس ہے اس کی قدر کیے بغیر۔ فیرس نے اسے کامیابی کے راستے پر ڈالنے میں مدد کے لیے ایک ٹھوس منفی تصور کی مشق کا استعمال کیا۔

2004 میں، وہ بتاتے ہیں، وہ اپنی ہی کمپنی، ایک آن لائن غذائی سپلیمنٹس خوردہ فروش میں ''پھنسا'' گیا تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ اسے کام سے کچھ وقت نکالنے کی ضرورت ہے تاکہ یہ طے کیا جا سکے کہ آیا کمپنی کو منظم کرنا ہے یا اسے چھوڑنا ہے، لیکن اس نے ایسا کرنے سے گریز کیا کیونکہ وہ ناکامی کے خوف سے دوچار تھا۔

پھر سینیکا سے متاثر ہونے کے بعد، وہ کہتے ہیں، اس نے ''11 x 8.5'' کاغذ کی ایک شیٹ لی اور اسے تین کالموں میں تقسیم کیا۔ پہلے کالم میں، اس نے ہر وہ چیز درج کی جو بریک لینے پر ہو سکتی تھی۔ دوسرے کالم میں، اس نے ایسے طریقے لکھے جو وہ ان منفی نتائج میں سے ہر ایک کو کم کر سکتے تھے۔ اور آخری کالم میں، اس نے ایک ایسا طریقہ طے کیا جو وہ ہر دھچکے سے نکل سکتا تھا

جب اس نے مشق ختم کی تو، وہ کہتے ہیں، یہ واضح تھا کہ اس نے جس کمپنی کی بنیاد رکھی تھی اس سے وقت نکالنے کے بعد وہ جس ممکنہ تکلیف کا مقابلہ کرے گا اس سے کہیں زیادہ وزن حاصل کرنے کے لیے کھڑا تھا۔

اس سے پہلے کہ اس نے سینیکا کا مشورہ لیا اور تصور کیا کہ مسئلے کی ممکنہ خرابیوں سے نمٹنا کیسا ہوگا، وہ اس کے ذہن میں بالکل تناسب سے بڑھ گئے اور اسے دباؤ اور دکھی بنا دیا۔

فیرس کا کہنا ہے کہ ''یہ بہت اہم ہے کہ آپ اپنے بدترین حالات پر عمل کریں، اور آپ کو جو کچھ ملے گا وہ یہ ہے کہ آپ کے بہت سے خوف ان چیزوں کو کم کرنے پر مبنی ہیں جو آسانی سے حاصل کی جا سکتی ہیں۔''

اسٹوکس نے ایک مشق کی تھی جس کا نام ٹرننگ دی اسسٹیکل الٹا ڈاون تھا۔ ان کا مطلب یہ تھا کہ فلسفے کے فن پر عمل نہ کرنا ناممکن ہے۔ کیونکہ اگر آپ کسی مسئلے کو صحیح طریقے سے الٹا کر سکتے ہیں، تو ہر ''بُرا'' اچھائی کا نیا ذریعہ بن جاتا ہے۔

ایک لمحے کے لیے فرض کریں کہ آپ کسی کی مدد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور وہ بدتمیزی سے یا تعاون کرنے کو تیار نہیں۔ اپنی زندگی کو مزید مشکل بنانے کے بجائے، مشق کہتی ہے، وہ دراصل آپ کو نئی خوبیوں کی طرف لے جا رہے ہیں۔ مثال کے طور پر، صبر یا سمجھ۔ یا، آپ کے کسی قریبی شخص کی موت؛ حوصلہ دکھانے کا موقع۔ مارکس اوریلیس نے اسے اس طرح بیان کیا: ''عمل کی راہ میں رکاوٹ عمل کو آگے بڑھاتی ہے۔ جو راستے میں کھڑا ہوتا ہے وہ راستہ بن جاتا ہے۔''

بلوچ قوم کا تاریخی پس منظر

شبیر احمد ارمان

بلوچ یوم ثقافت امسال 2 مارچ کو پاکستان، ایران، افغانستان، دبئی، مسقط، بحرین، سعودی عرب اور بھارت میں شایان شان انداز سے منایا گیا ہے۔ بلوچ اس دن کو روایتی جذبہ سے مناتے ہیں۔ بلوچ مرد، خواتین اور بچے اپنے روایتی لباس میں ملبوس رنگا رنگ ریلیاں نکالتے ہیں۔ مختلف اجتماعات کا بندوبست ہوتا ہے اور جشن کا سماں ہوتا ہے۔ اس مخصوص دن کی تیاری بھرپور انداز سے ہوتی ہے تاکہ دنیا کو بلوچ ثقافت زبردست طریقے سے پیش کیا جائے۔ بے شک ثقافت ہر قوم کی غمازی کرتی ہے لیکن بلوچ اپنی ممتاز ثقافت کو ایک کشش ثقل کے طور پر استعمال کرتے ہیں تاکہ پوری بلوچ قوم یکجا ہو کر نازاں ہو سکے۔ برطانوی اور فرانسیسی ماہرین آثار قدیمہ کی سروے ٹیموں نے بلوچ ثقافت کو دنیا میں ایک منفرد، مخصوص اور دوسری قدیم ثقافتوں کے مقابلے میں مضبوط ثقافت قرار دیا ہے۔ بلوچ قوم اپنی مہمان نوازی، جرأت اور ایفائے عہد کی وجہ سے مشہور ہیں۔ بلوچی خواتین اپنے حسین و جمیل ملبوسات خود تیار کرتی ہیں۔ بلوچ لباس اپنی خوبصورت کڑھائی اور ڈیزائن کے باعث قیمتی اور مشہور ہیں۔ بلوچ مرد بھی اپنے روایتی لباس زیب تن کر کے تلواروں کے سائے میں پر جوش بلوچی رقص پیش کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ پر شکوہ بلوچ ثقافت دنیا کی توجہ کا مرکز ہے

اور بلوچ یوم ثقافت اس کا آئینہ ہے۔ بلوچ دین اسلام کی پیروی کرتے ہیں اور انکی ثقافتی شناخت میں مذہب ایک اہم جز ہے انہیں یکجا کرنے اور متحد رہنے میں مدد دیتا ہے۔ بلوچ مردوں کی مقبول پوشاک میں پگڑی شامل ہے، ڈھیلی چوڑے گھیر کی شلوار اور گھٹنوں سے نیچی ڈھیلی قمیص شوق سے پہنی جاتی ہے۔ بلوچ یوم ثقافت بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ کے علاوہ اسلام آباد، لاہور، فیصل آباد، ملتان، ساھیوال، ڈیرہ غازی خان اور کراچی میں دھوم دھام سے منایا جاتا ہے۔ یہ دن متنوع بلوچ ثقافت کو سمجھنے اور اجاگر کرنے کے لیے اچھا موقع ہے۔ اس میں بلوچ ادب اور موسیقی بھی مضبوط روایات اور ثقافتی اقدار کا حصہ ہیں۔ یہ خوش آئند بات ہے کہ امریکی، جرمن اور چند یورپی سفارت خانوں میں بھی بلوچ یوم تقریبات کا انتظام ہوتا ہے۔ بلوچ ثقافت کی عکاسی کی خاطر بلوچ کھانے، لوک گانے اور رقص و موسیقی کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ 2009ء میں دینا بھر میں بلوچ قوم کی آبادی 39.98 ملین شمار کی گئی ہے۔ جس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔ 2013ء میں پاکستان میں بلوچ قوم کی آبادی 6,90,000,000 شمار کی گئی تھی۔ ہمارے پڑوسی برادر ملک ایران میں بلوچوں کی آبادی 4,95,557,000 ہے۔ 2009ء میں سلطنت عمان میں بلوچوں کی آبادی 434,000 شمار کی گئی تھی۔ اسی سال یعنی 2009ء تک ہمارے پڑوسی ملک افغانستان میں 1،000،000 بلوچ آباد ہیں؟

متحدہ عرب امارات میں 500,000، بھارت میں 600,000 اور ترکمانستان میں 300,000 بلوچ آباد ہیں۔

بلوچ کے لفظی معنی ہیں "بلند تاج" تاریخی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ خود بلوچوں کے پاس ایک نظم کے سوا کوئی قدیم مواد نہیں۔ اس نظم میں آیا ہے کہ وہ امیر حمزہؓ کی اولاد ہیں اور حلب سے آئے ہیں۔ یہی درست معلوم ہوتا ہے۔ اس میں مزید یہ بیان ہوا ہے کہ انھوں نے کربلا میں حضرت امام حسین علیہ السلام کا ساتھ دیا تھا اور ان کی شہادت کے بعد وہ بامپور یا بھمپور پہنچے اور وہاں سے سیستان اور مکران آئے۔ بلوچوں کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے نہ صرف کربلا میں حضرت امام حسینؓ کا ساتھ دیا بلکہ ان دنوں جب کہ رسول اللہ ﷺ مکہ میں بے یار مددگار تھے تو بلوچوں نے اپنے قبائل سے پانچ بہادر منتخب کر کے رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کے لیے بھیجے اس بات کا پتہ بھی ہمیں بلوچی کی ایک نظم سے چلتا ہے۔ 532 قبل مسیح میں بلوچ بحر خضر کے جنوبی ساحلی علاقے اور کوہ البرز کے دامن میں رہتے تھے۔ ان میں جو تھوڑے متمدن ہو گئے وہ حکومت اور فوجی خدمت کرنے لگے۔ زرکس کے عہد میں بلوچ ایرانی بادشاہوں کے دربار میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ لیکن بعد میں بلوچ ایرانی بادشاہوں کے لیے خطرہ بن گئے۔ اس لیے انہوں نے نہایت بے دردی سے ان کے خلاف جو مہم بھیجی تھی اس کا تذکرہ فردوسی نے شاہنامے میں بڑی تفصیل سے کیا ہے گمان ہے کہ اس مہم کے نتیجے میں بلوچوں کی قوت اس علاقے میں ٹوٹ گئی اور مجبوراً جنوب و مشرق کے پہاڑوں میں جا کر رہنے لگے لیکن ڈیمز نے اپنی کتاب ''دی بلوچ ریس'' اور گینکووسکی نے اپنی کتاب ''پیپل آف پاکستان'' میں قیاس کیا ہے کہ سفید ہنوں کی یورش کی وجہ سے بلوچوں نے بحر خضر کے جنوبی پہاڑوں سے کرمان کی طرف کوچ کیا۔ بہر حال اس سلسلے میں کوئی بات وثوق سے نہیں کی جاتی کرمان کے بلوچ خانہ بدوشوں کا ذکر عرب سیاحوں، مورخوں اور جغرافیہ نویسوں نے بھی کیا ہے۔ ڈیمز نے بلوچوں کی ہجرت کے بارے میں اپنی کتاب ''دی بلوچ ریس'' میں لکھا ہے (ترجمہ کامل القادری) ''یہ بات قرین قیاس ہے کہ بلوچوں نے دو مرتبہ نقل مکانی کی اور دونوں بار ہجرت کی وجہ ایک بڑے علاقے میں نئے فاتحوں کی پیش قدمی تھی پہلی ہجرت اس وقت ہوئی جب فارس میں سلجوقیوں کے ہاتھوں ولیمی اور

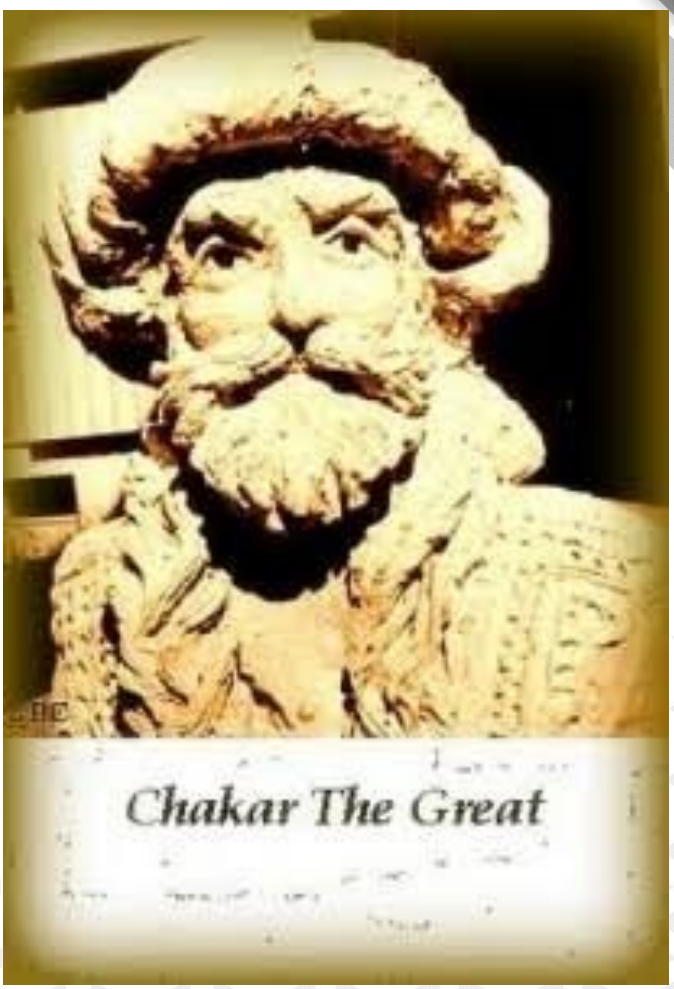

غزنوی طاقتوں کا خاتمہ ہوا۔اس موقع پر یہ لوگ کرمان چھوڑ کر سیستان اور مغربی مکران کے علاقوں میں آکر آباد ہوئے۔دوسری بار انہوں نے اس علاقے کو چھوڑ کر مشرقی مکران اور سندھ کا رخ کیا۔یہ ہجرت چنگیز خان کے حملوں اور جلال الدین منگول کی وجہ سے ہوئی۔دوسری ہجرت کے نتیجے میں انھوں نے پہلی بار وادی سندھ میں قدم رکھا جس سے ان کے لیے تیسری اور آخری ہجرت کا راستہ ہموار ہوا اور اس آخری ہجرت نے ان کے بڑے حصے کو ہندوستان کے میدانی علاقوں میں منتشر کر دیا۔اس آخری ہجرت کا زمانہ ہندوستان پر تیمور لنگ کے حملے اور بابر کی یورش کا زمانہ ہے'' بعض قبیلوں نے قلات پر قابض ہو کر بلوچوں کو سندھ اور پنجاب کے میدانی علاقوں کی طرف جانے پر مجبور کر دیا۔ یہ واقعہ بلوچی تاریخ میں ناقابل فراموش ہے۔اس واقعہ کے بعد یہ قوم دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ محمد سردار خان بلوچ نے اپنی کتاب میں لکھا کہ بلوچ روایت کے مطابق سردار امیر جلال خان بلوچ تمام بلوچ قبائل کے سردار تھے جو گیارہوں عیسوی میں کرمان کے پہاڑوں اور لوط کے ریگستان میں رہتے تھے۔ بلوچوں کی مقبول عام روایات اسی سردار کے عہد سے شروع ہوتی ہیں۔ سردار امیر جلال خان بلوچ کے چار بیٹے رند، کورائی، لاشار اور ھوت تھے آگے چل کر رند کی اولاد سے امیر چاکر خان رند بن امیر شہک پیدا ہوا۔ جو بلوچ نسل کا عظیم سپوت کہلاتے ہیں۔

سردار میر چاکر خان رند بن سردار امیر شہک رند بن سردار امیر اسحاق رند بن سردار امیر کالو رند بن سردار امیر رند بن سردار امیر جلال خان رند بلوچ۔

میر چاکر رند یا چاکر اعظم صرف ایک نام یا ایک شخصیت نہیں بلکہ بلوچوں کی تہذیب و ثقافت، تاریخ و تمدن، معیشت و معاشرت، اخلاق و عادات، بہادری و جوانمردی، جوش و جذبہ، گفتار و کردار، ایثار قربانی، ایفائے عہد اور انتقام کا نام ہے۔ سردار میر چاکر رند خود بھی بہادر تھے اور بہادر دوستوں ہی کی نہیں بلکہ دشمنوں کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور بقول میر چاکر ''بہادروں کا انتقام بھی مجھے پیارا ہے جو میرے اونچے قلعوں پر حملہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں'' میر چاکر خان مکران کے قیام کے دوران اپنی ابھرتی جوانی میں ہی قوم میں مقبول ہو گئے تھے۔قلات پر حملے کے دوران بہادری کے وہ جوہر دکھائے کہ لوگ انگشت بدنداں رہ گئے۔ میر شہک کے انتقال کے بعد پورے رند علاقوں کا حکمران ان کا بیٹا میر چاکر تھا اور رندوں کی تاریخ کا سنہری دور تھا لیکن اس دور کا اختتام اتنا تاریک اور عبرت انگیز ہے کہ میر چاکر کے

آخری دور میں نہ صرف رند بلکہ پوری بلوچ قوم اس طرح منتشر ہوئی کہ آج تک دوبارہ اکھٹی نہ ہو سکی۔ میر چاکر کا دور بلوچوں کا عروج اور خوشحالی کا دور تھا اور آج بھی بلوچ قوم کا اجتماعی طور پر ہیرو میر چاکر رند ہے اور آج بھی میر چاکر کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ بقول میر چاکر ''مرد کا قول اس کے سر کے ساتھ بندھا ہے'' اور میر چاکر اپنے قول کا دھنی تھا۔ اپنے قول کیمطابق ایک مالدار عورت ''گوھر'' کو امان دی اور اس کی حفاظت کے لیے جان کی بازی لگادی اور اپنے ہی بھائیوں لاشاریوں سے جنگ کی جو تیس سال کشت و خون میں بدل گئی اور یہی جنگ کئی نامور رند اور لاشاریوں کو خاک و خون میں نہلا گئی جن میں میر چاکر کے دو نوجوان بھائیوں کے علاوہ میر ھان، ھمل، جاڑو، چناور، ھلیر، سپر، جیند، بیبگر، پیرو شاہ اور دیگر سیکڑوں بہادر بلوچ شامل تھے۔ بلوچوں کی معاشرتی زندگی میں وعدہ خلافی کے علاوہ جھوٹ بولنا معیوب سمجھا جاتا ہے، خاص کر اگر وہ رند بلوچ ہو بقول چاکر خان رند کے ''سچ بولنا بلوچوں کا شیوہ ہے اور جھوٹ ایمان کی کمزوری کی نشانی ہے'' بلوچ معاشرے میں جو کوئی جھوٹ بولے اور وعدہ خلافی کرے تو ان کے معاشرے میں کوئی مقام و عزت نہیں ہوتی اور ان کی نظر میں وہ شخص زندہ نہیں بلکہ مردہ ہے اور رندوں کی ایک کہاوت ہے کہ ''مرے ہوئے رند کو کوئی راستہ نہیں ملتا دونوں طرف سے ان کی زندگی اسیر ہے'' بلوچ لوگ بالخصوص رند بلوچ لوگ عورتوں اور بچوں پر کبھی ہاتھ نہیں اٹھاتے، مہمان اور مہمان نوازی بلوچ معاشرے کا ایک لازمی حصہ ہے اور مہمانوں کو خدا کی نعمت سمجھتے ہیں۔ سردار چاکر خان رند کی تاریخ پیدائش کی مختلف روایات ہیں، ان میں سب سے زیادہ معتبر 1486 اور قلات کو 1486 فتح کیا کہ در آن وقت سردار چاکر کی عمر صرف 16 سال تھی اور سال 1488 میں سبی پر قبضہ کیا اور اسی سال میر شہک وفات پاگئے اور رند اور لاشار کی تیس سالہ جنگ کا آغاز سال 1489 میں شروع ہوا جو 1519ء میں اختتام پذیر ہوا۔ میں میر چاکر ملتان کی روانہ ہوئے اور 1523 میں مستقل طور پر سنگھڑہ میں قیام کیا اور 1555 میں ہمایوں کے ساتھ دہلی پر حملہ آور ہوئے اور شیر شاہ سوری کے جانشینوں کو شکست دے کر دہلی فتح کیا اور 1565 میں یہ عظیم قائد اس دنیائے فانی کو چھوڑ کر خالق حقیقی سے جاملے اور بمقام سنگھڑا وکاڑہ میں دفن ہوئے۔ بلوچ اپنے سردار میر جلال خان کی سرکردگی میں کرمان کے مختلف اضلاع میں رہتے تھے مگر سیاسی انتشار کی وجہ سے وہ قافلہ در قافلہ کرمان چھوڑ کر سیستان چلے آئے۔ جب یہاں بھی چین نہ ملا تو وہ اپنے سردار امیر جلال خان کی قیادت میں واپس کرمان گئے اور ضلع بام پور میں آباد ہوئے، پھر سردار جلال خان اپنے چوالیس قبیلوں (پاڑوں) کو لے کر مکران کی طرف بڑھا اور یوں مکران کو بلوچستان کا نام دیا۔ اس کی آمد سے پہلے مکران پر مغول حکومت کرتے تھے۔ بلوچ سردار نے انھیں شکست دی جس سے مقامی آبادی کی وفاداریاں بھی انھیں آسانی سے میسر آگئیں، کیونکہ مقامی لوگ مغول کے ظلم و ستم سے تنگ آچکے تھے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ امیر جلال خان کی آمد سے پہلے مکران میں بلوچ آباد تھے، جو خانہ بدوش تھے بھیڑ بکریاں پال کر گزارہ کرتے تھے سردار کے ساتھ جو بلوچ مکران پہنچے وہ شہسوار تھے اور بہت منظم بھی۔ سردار جلال خان نے حکومت قائم کر کے انھیں قومیت کا احساس دیا اور قبائلی نظام کو مضبوط بنیادوں پر استوار کیا۔ پندرہویں صدی عیسوی میں بلوچوں کے دو قبیلوں رند و لاشار ساتھ ساتھ وسطی بلوچستان کی طرف بڑھے۔ جو لوگ ان کے مقابلے پر تھے یا وہ قتل کر دیے گئے یا انھوں نے اطاعت قبول کر لی۔ آخر میر چاکر خان رند کے عہد میں سارا بلوچستان بلوچوں کے قبضے میں آگیا اور وہاں ان کی حکومت قائم ہو گئی۔ میر چاکر خان رند ایک عظیم بلوچ تھے انھوں نے خضدار فتح کیا در مولا پر

قبضہ کیا۔ کچھی کے میدانوں کو فتح کیا۔ در بولان پر قبضہ کیا اور ڈھاڈر پر قبضہ کرنے کے بعد سبی کو فتح کیا۔اس کے بعد قبائلی حسد کی وجہ سے رند و لاشاریوں میں جنگ چھڑ گئی جو تیس سال تک جاری رہی۔ (ان دونوں قبائل کی جنگ نے بھی کئی داستانوں کو جنم دیا ہے) اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ کئی بلوچ قبائل سندھ اور پنجاب میں ہجرت کرنے پر مجبور ہو گئے اور بلوچ منتشر ہو گئے جس میں بلوچوں کا بہت نقصان ہوا۔ بلوچوں کا ذکر شہنشاہ بابر کی خود نوشت تزک بابری اور شہنشاہ ہمایوں کی بہن گلبدن بیگم کے تحریر کردہ ہمایوں نامے میں بھی موجود ہے۔ شہنشاہ بابر نے لکھا ہے ''میں نے حیدر علم دار کو بلوچوں کی طرف بھیجا۔ بھیرہ اور خوشاب سے دوسرے دن بلوچ گھوڑے کی ڈالی لے کر آئے اور اطاعت کا وعدہ کیا ''1539 کو ہمایوں نے شیر شاہ سوری سے تونسہ کے مقام پر شکست کھائی اور دشت نوردی کے عالم میں اوکاڑہ کے قریب ست گرہ پہنچا جہاں میر چاکر خان کے ایک امیر بخشو بلوچ نے شہنشاہ کو غلے کی سو کشتیاں امداد کے طور پر دیں۔ گلبدن بیگم نے جو ہمایوں کے ساتھ ہمایوں نامے میں بخشو بلوچ کی امداد کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ایران جاتے ہوئے شہنشاہ ہمایوں بلوچستان سے گزرا جب وہ نوشکی پہنچا تو ایک بلوچ سردار ملک خطی نے اسے پناہ دی اور اگلے دن اسے ایران کی سرحد پر چھوڑ کر آیا شہنشاہ نے انعام کے طور پر اسے ایک انمول ہیرا دیا۔ جب شہنشاہ ہمایوں نے تخت دہلی کے لیے ہندوستان پر چڑھائی کی تو اس کے لشکر میں چالیس ہزار بلوچ جوان تھے جن کا سالار میر چاکر خان رند کا بیٹا میر شاہ داد خان تھا۔ بلوچ قوم سب سے زیادہ بہادر اور دلیر قوم مانی جاتی ہے اور بہادر قوم کی ایک بڑی نشانی یہ ہوتی ہے کہ آبادی کے لحاظ سے ان کے پاس رقبہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ بلوچستان کا رقبہ اور آبادی دونوں بلوچ قوم کی بہادری کا واضح ثبوت ہے۔ چاہے ایران کا بلوچستان ہو یا پاکستان کا یا افغانستان کا بلوچستان۔ بلوچ قوم اس خطے میں سب سے زیادہ رقبے اور سمندر کا مالک ہے۔ اس کے علاوہ مسقط، عمان، بحرین، شام، عراق، کردستان اور سعودی عرب میں بلوچ ہزاروں سالوں سے آباد ہیں اور بلوچ قوم نے اپنی زمین کی طرف کسی بھی قوت کو آگے نہیں بڑھنے دیا، ہر قوت کو شکست دے کر بلوچ زمین کا دفاع کیا جو بے پناہ دولت سے مالا مال ہے جس پر پوری دنیا کی نظریں تھی۔ آج سے نہیں صدیوں سے کبھی پرتگالیوں نے بلوچ بحیرہ پر قبضہ کرنے کے لیے حملے کیے اور شکست سے دوچار ہوئے تو کبھی برطانیہ نے بلوچ دولت کو پانے کے لیے بلوچستان پر اپنا قبضہ جما کر دولت کو برطانیہ شفٹ کرنے کا سوچا لیکن کامیاب نہیں ہو سکا۔ بلوچ اپنی سلطنت جو کہ ایران افغانستان تک پھیلی ہوئی ہے کو نہیں محفوظ رکھتے تو بلوچ بحیرہ پر پرتگالی قابض ہوتے اور بلوچستان کی بہت زیادہ دولت ہندوستان کے کوہ نور ہیرے کی طرح برطانیہ کی ملکیت ہوتی۔ انگریزوں نے بھی بلوچ قوم کے بارے میں کہا تھا کہ ''بلوچ قوم صرف عزت کی بھوکی ہے عزت دو گے تو یہ تمہیں بدلے میں امن اور چین کی نیند دیں گے'' آج بلوچ قوم کو جنگ کی نہیں قلم کی ضرورت ہے بلوچ قوم پاکستان کی شان ہے، پاکستان کی معیشت کا دارومدار بلوچستان پر ہے۔ ■

ABU HURAIRAH (RA) HONOR AND DIGNITY IN ISLAM

Yusra Salim

Abu Hurairah (R.A) reported that the Prophet (SAW):

"Whosoever believes in Allah and the Last Day, then let him speak always good or remain silent".

Islam endows men and women with "Human Honour and Dignity" (al-'Izzah wa al -Karamah) and provides them with directions and guidelines to protect each other's rights with respect and honour. This research paper demonstrates the protection of honor and dignity as a significant tool of life. The denotation of "honor" and "dignity" according to the Qur'an and prophetic perspective has been focused in this research. In the preservation of human personal honor, dignity and other rights, Shari'ah evidences from Qur'an and Sīrah are explored with the perspective of highlighting the emphasis on Shari'ah on this aspect of religion, which is also one of the dimensions of Maqaṣid al-Shari'ah as well. The paper ends with the note that human beings should endure the "best moral and ethical values" of mercy, faith, compassion, justice, piety, empathy and also with the fear of abusing one's honor and status in the society.

Human dignity has been one of the central themes in Islamic teachings. Islam is very concerned about the dignity of a person and highlights the status of protecting 'honor' and 'dignity'. It doesn't permit a person to abuse one's honor because one of the necessary features in the life of a person is his or her 'dignity' and 'honor'.

In the Holy Quran, Allah (S.W.T) takes account of all the humans to be worthy of respect and honor because human beings alone are trustworthy to prefer the "trust" of liberty of the free will. All the mankind is distinguished from other creatures on the earth and they are blessed with the persuasive aptitude by Allah, the Al-Mighty. The Glorious Quran clearly declares that human beings are blessed with the capability to judge between right and wrong wisely. Allah (S.W.T) had made them "in the best of molds". Thus, man is a representative on this earth, so that on account of this trait all humankind is respected and honored by Lord; The Creator. To begin with, we declaim the straight and definite confirmation of the dignity and honor of man, Allah, the Most High, announces in a general and unqualified declaration: "Verily we have honored the progeny of Adam..."

The Holy Prophet's make an effort primarily to reduce the social and economic injustices prevailing in the society so as to

promote human dignity. The Sīrah of the holy Prophet (SAW) demonstrates multiple incidents of supporting the importance of dignity of human beings to be respected by fellow-men, for upholding the honour bestowed by Almighty Allah.

In spiritual ranking, human beings are higher than angels. Allah (S.W.T) ordered to the 'angels' and the 'Iblīs for bowing down to Adam (A.S). On that the angels bowed down, but 'the' Iblīs rejected to do so;

"And We created you, then fashioned you, then told the angels: Fall ye prostrate before Adam! And they fell prostrate, all save 'Iblīs, who was not of those who make prostration" (Surah al A'rāf, 11)

In the Universe, the divine ultimate objective in creating human beings is "dignity and honor" of a creature and the instrumental attitude towards other beings. Allah (S.W.T) explicates clearly that man is the eventual reason of creation in all circumstances. He explains it with proofs such as the earth, sky, day and night, rain, seas, mountains, animals, and their philosophy of creation.

The philosopher and commentator, indicates the explanations of this verse over human dignity and honor. He says, the word lakum shows that "whatever made after man's creation is only for his interest in religion and the world; they are for the interest of his body and also he can get energy for obeying God in the world and in religion, he can think about the signs of earth and heavens and the wonders of creation of God. So, this is indicative of man's superiority; for God created whatever is in earth and sky for the interest of man". According to him, one of its reason is that "this verse after the first blessing (creation of alive and powerful man during history) mentions another blessing which is related to it and it consists of enjoying earth and sky and whatever is in them". Surprisingly, he says: "What is good to consider the order from God; for this enjoyment will do after the realization of life. Therefore, at first God mentioned the life and then the earth and heavens in this verse".

Dignity and honor is a gift from Allah (S.W.T). In this mortal world the purpose behind the creation of everything is to bring about and maintain a high-and-mighty position of humankind, all other things are unimportant before its status. Textual evidences from Quran and Sunnah not only support this phenomenon but various evidences from the Sīrah shown the emphasis laid down by he Holy Prophet on respect for dignity and honour. In Islam, the conception of human honor and dignity offers a neutral basis to the contemporary doctrine of human rights, as depicted in objectives of Shari'a. The article concludes that the inherent dignity of man is the foundation of human rights which emphasized that all human rights are derived from the inherent dignity of the human person. The contribution of the Prophet (SAW) of Islam to the enhancement of human dignity is diversified; the theoretical foundations of human dignity found their basis in the Sīrah of the Holy Prophet (SAW).

Abu Hurairah (R.A) reported that the Prophet (SAW) said:

"Indeed, the servant will speak words that are pleasing to Allah, due to which he will be given a condition in which Allah will raise him many levels. And indeed, the servant will speak words that are displeasing to Allah, due to which he will not be given a good condition, but (instead) be thrown into the Hellfire".

وزیر اعلیٰ سید مراد علی شاہ ملیر کے گڈاپ میں ایڈمز نیورو سائیکیٹرک ہسپتال کے
سنگ بنیاد کی تقریب سے خطاب کر رہے ہیں۔

وزیر اعلیٰ سندھ سید مراد علی شاہ نے گڈاپ، ملیر میں چلڈرن آف آدم کی جانب سے قائم کیے جانے والے
نیورو سائیکاٹرک اسپتال کا سنگ بنیاد رکھنے کی تقریب میں تختی کی نقاب کشائی کرتے ہوئے۔

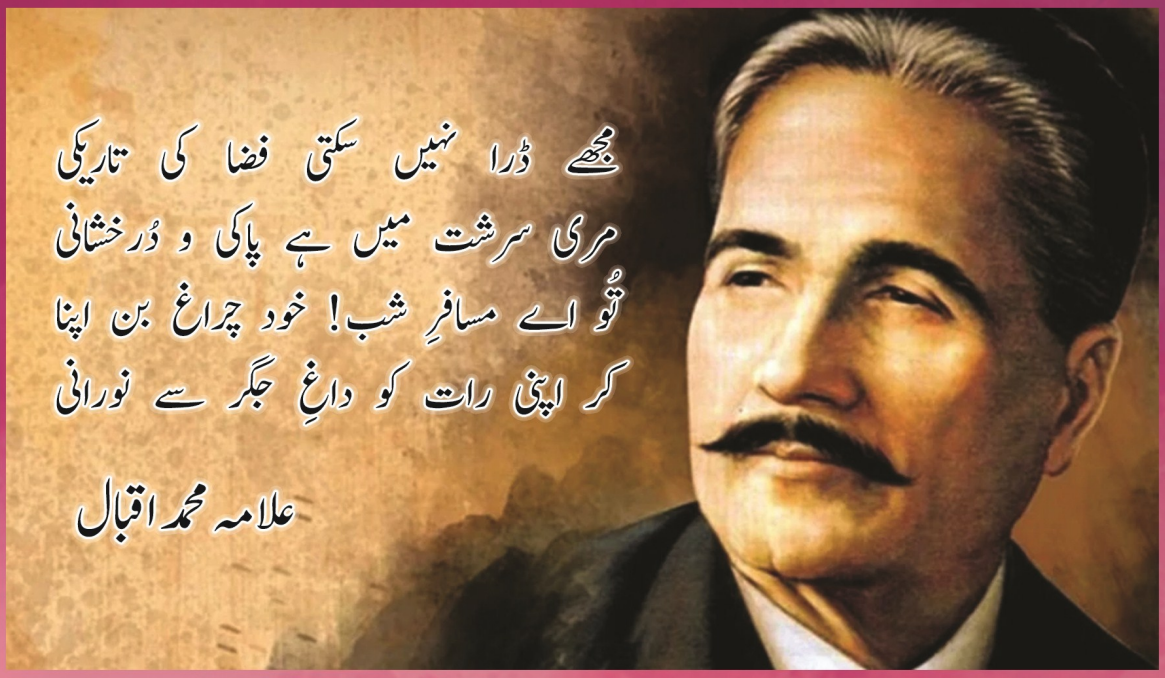

علامہ اقبال محض ایک شخصیت نہیں بلکہ تاریخ کا ایک مکمل باب ہیں جو جامعیت اور ہمہ گیریت کو یوں اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں کہ ان کی شخصیت کا احاطہ کرنا مشکل نظر آتا ہے۔ سادگی، سنجیدگی اور کم گو فطرت کے ساتھ علامہ اقبال ایک لطیف طبیعت کے مالک تھے مگر خاموشی کا عنصر طبیعت پر غالب تھا۔

اسپین کے شہر قرطبہ کی سیاحت کے دوران، علامہ اقبال مسجد قرطبہ دیکھنے گئے جو عیسائیوں نے قبضے کے بعد گرجا گھر میں تبدیل کر رکھی تھی، علامہ اقبال اس دردناک تبدیلی پر بہت افسردہ ہوئے، انہوں نے پادری سے کہا کہ وہ انہیں یہاں دو نفل پڑھنے کی اجازت دے۔ پادری سوچ میں پڑا تو علامہ اقبال نے اس سے کہا، ''تم عیسائی لوگ ہم مسلمانوں سے یہ سلوک روا رکھتے ہو جب کہ مسلمانوں نے تمہارے ساتھ کبھی ایسا سلوک روا نہیں کیا۔'' پادری علامہ کے اس فقرے سے بہت متاثر ہوا اور اس نے علامہ کو نفل پڑھنے کی اجازت دے دی۔ علامہ اقبال نے وہاں خشوع و خضوع کے ساتھ دو رکعت نفل ادا کیے دعا مانگی اور مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کو یاد کیا۔ قرطبہ پر عیسائیوں کے قبضے کے سات سو سال گزر جانے کے بعد علامہ اقبال وہ پہلے مسلمان تھے جنہوں نے اس جگہ رب العالمین کے حضور سر جھکایا اور اسلام کی حقانیت کا اعلان کیا۔